ناول
گُرگِ شب
اکرام اللہ
عکس
AKSPUBLICATIONS

کتاب	گرگِ شب (ناول)
مصنف	اکرام اللہ
سن طباعت	2019ء
تعداد	500
قیمت	300

AKSPUBLICATIONS
Ground floor Mian Chamber3 - Temple Road
Ph:042-37300584,Cell # 0304-2224000, 0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

ہاشم خان

اور

ہاشم خانی جتھے

کے نام

لفظ چند

آج کل پڑھنے والوں نے گردپوش کی عبارتوں میں یقین کرنا چھوڑ دیا ہے، اس لیے میں اس بات کی امید نہیں رکھتا کہ جو کچھ میں اس کتاب کے بارے میں کہوں گا، اس میں یقین کرلیا جائے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اکرام اللہ کا یہ ناولٹ ''گُرگِ شب'' ایک بڑا ادبی شہ پارہ ہے اور اردو افسانے کا مذاق رکھنے والے اسے حرزِ جاں بنالیں گے۔ اکرام اللہ کا خداداد جوہر، اس کا حسنِ تحریر میرے یا آپ کے قلم کی تعریف کا محتاج نہیں۔

یہ یقیناً اعلیٰ درجے کا ادب ہے اور اس ناولٹ کے چھپنے پر ہمیں دیوتاؤں کے اس کرم پر سچ مچ خوشی کے شادیانے بجانے چاہئیں: ''گُرگِ شب'' کے آنے سے مایوسی کا رنگ تازگی اور امید میں بدل گیا ہے اور بے کسی پر نوحہ خوانی کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اکرام اللہ نے ایک ایسا کام کیا ہے کہ اگر چیئرنگ کراس پر اس کا سونے کا بُت قائم کیا جائے تو مناسب ہوگا۔

''گُرگِ شب'' ایک ایسے الجھے ہوئے، دراڑ پڑے شخص کی کہانی ہے جو ایک incest کے رشتے سے اس دنیا میں آیا ہے، اور اب اپنی ذہنی گرہوں کی وجہ سے اپنی شرم اور اخلاقی رکاوٹوں کی دیوار پھاند کر ایک عام اوسط آدمی کی ذہنی اور جسمانی زندگی کا حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا ہے۔ وہ اس جنسی اور جذباتی محرومی کے ہولناک خلا کو پُر کرنے کے لیے، اپنی تنہائی سے بچنے کے لیے، شراب کا سہارا لیتا ہے۔ اس کا عزم یا اس کا قابل اعتبار کاروبار بھی اسے اپنے وحشت ناک خوابوں سے مہلت نہیں دلاتے اور رفتہ رفتہ اس کے ہوش و حواس جواب دینے لگتے ہیں اور وہ اس زینے پر سے نیچے گرنے لگتا ہے۔ ایک

سنگدل، بے پروا مقدر سے دھکیلا ہوا، جو سیدھا پاگل خانے اور مکمل ذہنی انتشار کی طرف جاتا ہے۔

جس خوبصورتی، فنی مہارت، قوت اور لطافت سے مصنف نے ایک آدمی کے ایسے کی عجیب اور حیرت انگیز کہانی لکھی ہے وہ ہمارے ادب میں ایک نئی چیز ہے۔ اس کی نثر نکھری ہوئی، روشن اور کس بل والی ہے اور اس کی کتاب ان کتابوں میں سے ہے جو دل کے خون میں ڈبو کر لکھی جاتی ہیں۔

آپ ''گرگِ شب'' کو ایک بار پڑھنے کے بعد بار بار پڑھیں گے۔

محمد خالد اختر

ناول کے بارے میں چند باتیں

یہ بات کہ ایک الزام، جس کی تصدیق یا تردید ناممکن معلوم ہوتی ہے، کسی فرد کی زندگی میں اتنا زہر گھول سکتا ہے کہ اس کے لیے راحت کا سانس لینا مشکل ہو جائے، انہونی نہیں۔ سب کے ساتھ تو یہ نہیں ہوتا لیکن ہزار میں دس پندرہ آدمی ایسے ضرور مل جائیں گے جنھیں، یوں کہیے، کسی جھوٹے سچے الزام نے مصلوب کر رکھا ہو۔ وہ زندہ رہتے ہیں لیکن انھیں صلیب سے اُتارنے والا کوئی ہم درد نہیں ملتا اور مل بھی نہیں سکتا کیوں کہ یہ مصلوبیت ظاہر میں نہیں، باطن میں ہے جس تک اپنے سوا کسی اور کی رسائی خیالِ خام ہے۔ انجامِ کار، بے سود ہاتھ پیر مارنے کے بعد، زندگی دیوانگی کی طرف ایک تکلیف دہ سفر بن جاتی ہے۔

اکرام اللہ کا ناول ''گرگِ شب'' ایک ایسے ہی فرد کی روداد ہے جسے بڑی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ واقعات کی بنت میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ مرکزی کردار کو لڑکپن ہی میں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ حلالی نہیں حرامی ہے؛ اور حرام کی نوعیت بھی ایسی ہے جو معاشرے کو بالکل قبول نہیں۔ جب یہ ناول پہلے پہل شائع ہوا تھا تو پڑھنے والوں کو شاید اس طرح کی ''جراتِ رندانہ'' گراں گزری ہو۔ لیکن آج، چالیس سال بعد، جب پاکستان میں اخلاقی پستی خطرے کے نشان سے کہیں اوپر پہنچ گئی ہے، (پستی کی اُونائی بھی عجیب اور پر تضاد ہیبت ناکی کی حامل ہے) جہاں بچوں اور بچیوں کو بدفعلی اور تعذیب کا نشانہ بنا کر قتل

کرنا اور معاشرے میں زنا بالجبر اور غارت گری معمول بن چکا ہے، یہ ناول ذرا بھی بھیانک معلوم نہیں ہوتا۔ ناول میں جس فرد کا احوال ہے وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے لیکن جو انتقام لیتا ہے خود سے لیتا ہے، کسی اور کو ضرر نہیں پہنچاتا۔ اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کی رمق باقی ہے۔

مرکزی کردار نے اس خاندان اور گانو کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا جہاں اسے ہر وقت کچھ کچوکوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مکمل قطع تعلق کے بعد اس نے اپنا نام بدل لیا اور ایک بڑے شہر میں جا کر کام یاب کاروباری بن گیا۔ ایک بات کا اسے خیال نہ رہا، جیسے ہم میں سے بہت سوں کو خیال نہیں رہتا، کہ آپ ان تمام افراد سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں جن کی صرف موجودگی ہی طعنہ ثابت ہوتی ہے، اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ سکتے ہیں جس سے ناخوشگوار یادیں وابستہ ہوں، مگر اپنے آپ سے، اپنے اندر پلتے اور پھیلتے عذاب سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ دنیا میں ہر آسائش، ہر رہائش، ہر حیثیت کو تجنا ممکن ہے مگر اپنے آپ سے گلو خلاصی ناممکن ہے۔

اپنی کاروباری کامیابی اور خوش حالی کے باوجود مرکزی کردار کو چین کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔ اسے پتا چلتا ہے کہ شہر میں کوئی اس کا نہیں، وہ کسی کا نہیں۔ بیگانہ وار جی رہا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ وہ کسی سے جنسی طور پر ذرا دیر کے لیے تعلق پیدا کر سکے۔ شاید لاشعوری سطح پر جنسی عمل سے بھی، جس کے نتیجے میں اس کی ذات پر کلنک کا ٹھپا لگا ہے، اسے کراہت آتی ہے۔ وہ شراب کا دھتی ہو جاتا ہے۔ بسیار نوشی سے مراد غم غلط کرنا نہیں، اپنی شناخت غلط کرنا ہے۔ کلب میں ایک خاتون اس سے کہتی ہے: ''آپ تو اس طرح پیتے ہیں جیسے اپنے آپ سے کوئی بدلہ چکا رہے ہوں۔'' معمول سے ہٹی ہوئی یہ کوششیں بیماری اور دیوانگی کی راہ ہموار کرتی ہیں۔

اسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ ان خوابوں کے بیان میں مصنف نے خاصی

طباعی کا ثبوت دیا ہے۔ مرکزی کردار ان خوابوں کی معنویت کو ٹھیک طرح سمجھ نہیں پاتا۔ یہ تطہیر کا عمل ہے جو اس کے باطن میں جمع آڑ کباڑ کو بہا لے جانے یا ٹھکانے لگانے سے سروکار رکھتا ہے۔ کسی ان جانی سمت سے اسے بچانے کی آخری کوشش۔ ان خوابوں سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اگر انھیں صبر سے برداشت کرتا رہتا تو بالآخر شاید نجات کی کوئی صورت نکل آتی۔ وہ اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے، ماضی کے لوٹ آنے سے خوف زدہ ہے اور خود کو بچانے سے قاصر۔ وہ ایک کھلونا بن گیا ہے جس میں حالات کے ستم نے چابی بھر دی ہے اور وہ چکر پر چکر کھائے جا رہا ہے۔ آخر میں اسے ایک واہمے میں لگتا ہے کہ کمرے میں کہیں سے بہت سی مکھیاں گھس آئی ہیں۔ اس نے ایک دروازے کو کھلا رکھا جہاں سے روشنی کی ایک لکیر اندر آ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ مکھیاں باہر نکل گئیں۔ ایک مکھی پھر بھی رہ گئی اور اسے ستانے لگی۔ بمشکل تمام اس نے اس مکھی کو مار ڈالا۔ ''یہ مکھی تو میں نے ماری لیکن وہ مکھی جس کی بھنبھناہٹ اب بھی ذہن کے اندر ستاتی رہتی ہے اس کا کیا کیا جائے؟'' اس مکھی کا جیتے جی کچھ بگاڑا نہیں جا سکتا۔

اُردو میں لکھے جانے والے مختصر ناولوں میں ''گرگِ شب'' منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسے پڑھنا خوشگوار تجربہ نہ سہی۔ زندگی میں خوشگوار لمحے کم ہی آتے ہیں۔ اکرام اللہ کا ناول ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم سب میں ہم دردی اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کتنی کمی ہے اور دوسرے لوگ عذاب کیوں ثابت ہوتے ہیں۔ دوزخ بھی ہوگا لیکن ناول کے مرکزی کردار نے تو زندگی ہی میں دوزخ کا مزہ چکھ لیا اور غضب یہ کہ گناہ گار بھی نہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن

جب میں ایک ننھی سی لڑکی تھی
میری دو چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں سرخ ربن پھڑ پھڑاتے تھے
جب میں ایک ننھی سی لڑکی تھی
سبز سبز گھاس کے تختوں پر
بل کھاتی ہوئی جوئبار کے کناروں پر
اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے بوڑھے درختوں کے بیچوں بیچ
میں تتلی کی طرح سبک اڑتی چلی جاتی تھی
جب میں ایک ننھی سی لڑکی تھی!

دور، دور بجھے ہوئے ستارے بوجھل، اداس، سست نظروں سے قالین بچھے فرش کو تک رہے تھے۔ بندر کی طرح پھیلی ہوئی چپٹی ناکوں والے تین ٹھگنے، سانولے نوجوان بھنوؤں تک اپنے پھولے ہوئے بالوں میں ماتھوں کو چھپائے چاندی کے جھلملاتے تاروں والے سیاہ بروکیڈ کے کوٹ پہنے جنگلی بلوں کی طرح، ملگجے اندھیرے میں لپٹے ہال کے ایک کونے میں اپنے سازوں کے پیچھے دبے ہوئے اس عورت کو جسے اپنی چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں گندھے ہوئے سرخ ربنوں کا پھڑ پھڑانا یاد آ رہا تھا، سر تال مہیا کر رہے تھے۔

بیگم شمیم رستم علی نے اپنے بغیر بازو کے بلاؤز میں پہلے دائیں بغل کے پاس انگلی ڈال

کرا سے ذرا سا اوپر کھینچا، پھر اسی طرح انجانے سے انداز میں بائیں طرف ڈال کے یہی عمل دہرایا، پھر اپنی چھاتی پر ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے اپنے گدرائے ہوئے کولہے جن میں ان کی نسوانی شخصیت کا پورا وقار چھپا ہوا تھا ذرا سے میری جانب کھسکاتے ہوئے پاس بیٹھی ہوئی بیگم اے۔ بی شیخ سے ناک بھڑاتے ہوئے بات کرنے لگیں۔ ان کے دودھ کی طرح سفید پیٹ میں ناف کے اوپر ایک بڑا سا بل پڑ رہا تھا جیسے وہاں ایک چھوٹا سا تکیہ تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ وہ سامنے بیگم نرگس لطیف بیٹھی ہوئی ہیں، آپ جانتی ہیں انہیں؟ بیگم شیخ نے السیشن کتے کی دم کی طرح موٹی، پھولی پھولی چوٹی کو، جو ان کی گردن کے دائیں طرف سے ان کی چھاتیوں کے درمیان سے گزرتی ان کے ذرا سانولے چہرے کو نکھارتی ہوئی اور ان کی چھاتیوں کے ابھار کو اور واضح کرتی ہوئی ناف تک پہنچتی تھی، پیار سے تھپتھپایا جیسے اس عورت کا سر تھپتھپا رہی ہوں جس کے سر سے یہ بال اتر کے ان کی چوٹی کی زینت بنے تھے۔

''اچھا تو یہ ہیں بیگم نرگس لطیف جن کے آج کل اتنے اسکینڈل مشہور ہو رہے ہیں۔''

یہ فقرہ بیگم شیخ نے اس طرح حسرت بھرے انداز میں کہا کہ کاش ہم بھی اس قابل ہوتے کہ ہمارے اسکینڈل بھی لوگوں میں شہرت پاتے۔ میز پر رکھی چھوٹی سی خوبصورت بالٹی میں فاختئی رنگ کے کپڑے میں لپٹی ہوئی شیمپین کی بوتل اس طرح منہ کھولے تھی جیسے زمین پر پڑی مچھلی آخری سانس لینے کے لیے اپنا گول گول منہ کھولتی ہے۔ میں نے بوتل اٹھا کے پانچوں گلاس پھر سے بھر دیے۔ بیگم شیخ نے شکریہ کہتے ہوئے اپنی مخصوص ادا سے سرخ سرخ نازک خوبصورت نچلا ہونٹ ذرا سا میری طرف اس طرح بڑھایا جیسے چومنے کے لیے پیش کر رہی ہوں۔ میرے جسم میں ہلکی سی بجلی دوڑ گئی۔ میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا، اوہ پلیز ایسا بھی کیا۔

ایک بڑا پلا ہوا ادھیڑ عمر کا امریکن اپنے ساتھیوں کی طرف پیٹھ پھیرے گیت کی لہروں میں ہچکولے کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وقفوں سے بیر کے گلاس سے دو تین گھونٹ لے کر لمبی

سانس چھوڑتا اور پھر نشے سے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ لیتا۔ ایک دائرے میں پڑتی ہوئی تیز روشنی کے وسط میں وہ کھڑی تھی۔ اس کے سر پر سنہری بالوں کا چھتا تھا۔ سامنے رانوں تک کھلے اور ٹخنوں تک لمبے گاؤن میں اس کا بدن کسمسا رہا تھا جیسے سانپ کینچلی اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہماری میز کے قریب آ کے اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے سرخ یاقوتی ہونٹوں سے کھرج میں ڈوبی ہوئی، بڑی گھمبیر، افسردہ پکار نکالی میں تتلی کی طرح سبک اڑتی چلی جاتی تھی۔'' اس کے منہ کے اندر کتنے ہی دانت تھے جن کے بیمار منہ چاندی سے بند کر دیے گئے تھے، دانتوں کی ریخوں میں کتنی ہی سیاہیاں گلی ہوئی تھیں:
''جب میں اک ننھی سی لڑکی تھی۔'' یہ ہمیں اپنا ننھا پن کیوں نہیں بھولتا؟

اب سب لوگ گیت کے بہاؤ میں بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں، ہونٹ خاموش تھے، ٹھوڑیاں ہتھیلیوں پر دھری تھیں، ذہنوں میں گزرے ہوئے پیارے واقعات کے دھندلے دھندلے خاکے ابھرا ابھر کر کہیں گم ہو جاتے جیسے کسی ساکت جھیل میں ننھی ننھی لہریں بنتی، بگڑتی، مٹتی اور پھر بنتی رہتی ہیں۔ سب چہروں پر ایک معصومیت سی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھیڑیوں کا ایک ایسا گروہ ہو جو اپنے پنجے اور بتیسیاں گھر بھول آئے ہوں۔ وہ امریکن جس کا جسم اس کی فیروزی بش شرٹ میں چھن کر باہر ابل پڑنے کو تیار ہے اور جو نشے میں مست اس طرح جھوم رہا ہے جیسے چاندنی رات میں کوبرا مست ہو کر جھومتا ہے لیکن اس نے اپنی زہر سے بھری پوٹلی حلق سے نکال کر باہر پتھر پر رکھ دی ہو کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، جاتے ہوئے پھر پہن لوں گا۔ وہ اتنے غور سے کیا سن رہا ہے؟ یہ آدمی جس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا ہے اور جس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت گردن کی جڑ تک بیل کی لٹکتی کھال کی طرح چلا گیا ہے، جس کے گنجے سر پر سفید بالوں کی جھالر ہے، جو بچپن کی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے کیا اسے بھی یاد آ رہا ہے کہ جب وہ ایک ننھا سا لڑکا تھا اور نیویارک کی گلیوں میں ٹھٹھرتے ہوئے، ہاتھ جیبوں میں اڑسے، بستہ کندھے سے لٹکائے سکول جاتا ہوگا: ''جب میں اک ننھا سا لڑکا تھا۔''

کھدر کے سفید کپڑے میں سلیٹ اور قاعدہ باندھ کے لکڑی کی تختی پر رکھ کر میرے باپ نے بغل میں دبایا ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی مضبوطی سے پکڑی ہوتی۔ ان کی برف کی طرح سفید داڑھی تھی، منڈھے ہوئے سر پر پیچ در پیچ بڑا سا ڈھیلا ڈھالا پگڑ ہوتا، ٹخنوں سے اونچا تہمد اور سرخ چمڑے کے کسے ہوئے مکے کی طرح کی جوتی ان کے پاؤں میں چرچراتی۔ ان کا سرخ وسفید چہرہ دائیں بائیں اس طرح ہلتا رہتا جیسے مسلسل انکار کیے جا رہے ہوں۔ کچی گلی میں (جس کے درمیان میں سے کالی غلیظ کیچڑ سے بھری نالی پرانے زخم کی طرح ہمیشہ رستی رہتی) وہ مجھے اپنے چوڑے کندھے جھکائے نالی سے بچا بچا کے لیے جاتے۔ گلی کے دونوں طرف پرانی نانک شاہی اینٹوں کے اونچے اونچے مکان اپنے مکینوں کو صدف کی طرح سنبھالے خاموش کھڑے رہتے۔ اینٹوں پر جابجا کائی جمی ہوتی۔ کئی دیواریں خم کھا گئی تھیں اور بے بس ہوتی ہوئی اینٹوں کے درمیان سے گلابی گلابی دانے دار چونا گرتا رہتا۔ ادھر ادھر دیواروں میں سے کہیں کہیں کوئی پیپل یا بڑ کا پودا سر نکالے کھڑا لہرا رہا ہوتا۔ سنسان گلی میں کھلنے والے دروازے اس مضبوطی سے بند ہوتے جیسے شاید کبھی کسی طلسم کے زور سے کھلتے ہوں گے۔ ایک ذرا چڑھائی چڑھ کے ہم پکے فرش کے بازار میں پہنچ جاتے، بے آباد سے بازار میں دکاندار گاہکوں کے انتظار میں دوکانوں کے تختوں پر بیٹھے اونچی آواز میں ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہوتے۔ میاں جی مجھے پچکارتے، دلاسہ دیتے، گھٹنے سے لپٹاتے اور قدم بہ قدم بستہ سنبھالتے سکول لیے جاتے۔ دکان دار ہمیں دیکھ انگلیاں دانتوں میں دبائے ہماری طرف پیٹھ موڑ کے خاموش ہنسی ہنستے ہوئے اپنے پیٹ پکڑ لیتے۔

''جب میں اک ننھی سی لڑکی تھی''۔ سنہرے چھتے نے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ہال میں ایک دم سکوت چھا گیا۔ وہ بڑے سمارٹ انداز میں بھاگ کر پردہ اٹھا کے اندر چلی گئی۔ سورج نکل آیا؟ ہال کی چھت کے درمیان بہت بڑی روشنی جگمگا اٹھی۔ سازندوں نے ایک دھیمی سی گت بجانا شروع کر دی۔ لوگوں نے ان کا نوٹس لیے بغیر اپنی گفتگو شروع کر دی۔

ہلکی ہلکی شی شی اور ٹیڑھی ہوتی ہوئی انگلیاں بیروں کے لیے چلنے لگیں۔ روشنی ہوتے ہی پتلے دبلے رستم علی فوراً گویا اپنے ڈریس سوٹ کی آڑ میں چھپ گئے۔ ان کی گردن سے چہرے کی طرف جانے والی موٹی موٹی نسیں ہر وقت جونکوں کی طرح پھولی رہتیں۔ ان کی آواز دو شاخہ تھی بولتے تو یوں لگتا جیسے کوئی عورت بول رہی ہے۔ پھر بغیر سگنل دیے تین چار الفاظ مردانہ آواز میں بول دیتے۔ غصے، جوش اور گھبراہٹ میں ہوتے تو وہی زنانہ آواز نکلتی اور نکلتی چلی جاتی جس سے وہ بہت مضحکہ خیز نظر آتے۔ لیکن ان کی فرم میں کام کرنے والے کارندے اس مضحکہ خیز آواز سے لرزاٹھتے۔ ٹھیکے دینے والے سرکاری افسران یہ آواز سن کر مسکرا دیتے اور ان کا کام بن جاتا۔ البتہ بیوی کے سامنے وہ بڑے اہتمام سے موٹی آواز ہی نکالنے کی کوشش کرتے لیکن پھر بھی کہیں کہیں گلے سے باریک چیختی آواز سارنگی کے ٹوٹتے تاروں کی طرح دفعتاً نکل آتی تو بڑی معصومیت سے بیوی کا تاثر بھانپنے کی کوشش کرتے۔ اے۔ بی شیخ بھاری مشینری بنانے والی ایک غیر ملکی کمپنی البرٹ تھامس کے پاکستان میں انچارج تھے اور رستم علی خان ان کے بہت بڑے گاہکوں میں سے ایک تھے۔ ویسے تو اے۔ بی شیخ اور رستم علی میں کوئی بات مشترک نہ تھی لیکن کاروباری ناتے خون کے رشتوں کی طرح طبیعتوں کی مماثلت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب بڑے شستہ انگریزی لہجے میں فرفر انگریزی بولتے اور خوب کھل کر ہنستے۔ اس طرح ان کی جگہ جگہ سے کٹی پھٹی لوتھڑا سی زبان ان کے سیاہ ہونٹوں سے تقریباً آدھی باہر نکل آتی۔

اتنی گھناؤنی بھیانک زبان دیکھ کر مجھے بیگم ریحانہ شیخ پر ترس آنے لگتا۔ شیخ صاحب ہر نئی ملنے والی خاتون پر چند روز محبت بھری نظریں پھینکتے رہتے لیکن ہر بار مایوسی مقدر میں ہوتی۔ اسے وہ گاہے بہ گاہے کرائے کی عورتیں منگوا کر دور کرنے کی کوشش کرتے رہا کرتے تھے۔ بے چارے رستم علی تو گھر میں بھی مشکل سے بھگتان کرتے ہوں گے۔ شیخ صاحب نے رستم علی سے پوچھا: ''آپ اس موٹے کو جانتے ہیں؟''

''کون موٹا؟''

"یہ امریکن۔"

"نہیں تو۔"

"تعجب ہے...... یہ آپ کے پراجیکٹ پر نیا ایڈوائزر آیا ہے۔ مسٹر بل!"

"اچھا تو اس سے میرا تعارف کرادیں۔"

"اتنی بے صبری! کرا دوں گا۔ میری بھی کل پہلی دفعہ ایک پارٹی میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ کسی شام کلب لے جاؤں گا۔"

"اجی ظفر صاحب آپ مزے میں ہیں، نہ کوئی پراجیکٹ ڈائریکٹر نہ کوئی ایڈوائزر۔ نہ انجینئروں کی خوشامدیں نہ بل برانچ والوں کی منتیں۔ ادھر سستے داموں کاٹن خریدی اور ادھر مہنگے داموں دوسرے ملکوں برآمد کردی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"بس رستم علی صاحب آپ دور کے ڈھول سنتے رہیے۔ باقی ہم ہی جانتے ہیں۔"

بیگم شمیم رستم علی ریحانہ کو بڑے جوش میں سنا رہی تھیں: "باہر لان میں بینڈ بج رہا تھا۔ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں ایسے ہی تھا، ہوٹلوں وٹلوں سے انتظام کروانے کا رواج نہیں تھا۔ نوکر نوکرانیاں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ڈیڈی کے بیڈروم میں ہم لوگ مزے سے گلا پھاڑ پھاڑ کے ڈھولک پر گیت گا رہے تھے اور پاس پلنگ پر سرخ جوڑے میں ملبوس گڑیا دلہن بنائی رکھی تھی اور جناب......"

ریحانہ نے نادانستہ ہاتھ خالی گلاس کی طرف بڑھایا۔ میں نے بیرے کو متوجہ کیا: "یہ شیمپین کی ایک بوتل اور لاؤ۔" ریحانہ نے سرخ ہوتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسی مسکراہٹ چہرے پر آ گئی جو صرف دو ہلکے ہلکے سرور کی منزل پر پہنچے ہوئے لوگوں کے چہروں پر آ سکتی ہے جو دراصل ایک دوسرے کی شخصیت کا نیا خوشگوار اور ناقابل بیان حصہ دفعتاً پا لینے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ احساس کا یہ تجربہ صرف نشے میں میسر آتا ہے اور نشہ اترنے کے بعد گم ہو جاتا ہے۔

وہ بولی: "نو نو!، پلیز۔ ناٹ فارمی۔"

"سب میں برابر بٹے گی۔"

"تھینک یو۔ مجھے شمار سے باہر رکھیں۔"

شیخ صاحب بولے: "آ آ آااا......... میرے لیے تو آپ ایک وہسکی منگوالیں۔"

رستم علی نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی: "بارہ بجنے کو ہیں اب چلنا چاہیے۔ کیوں شمیم! اب ظفر صاحب سے اجازت نہ لیں؟"

اس نے دفعتاً چونک کر نہایت تابعداری سے اپنے خاوند کی بات کی تائید کی اور کسی قدر اٹھنے کے انداز میں جسم سنبھالا۔ مجھے باوجود تلاش کے اس کے انداز میں بناوٹ نظر نہ آسکی۔ اتنی اچھی ایکٹنگ کر گئی، شاید اس لیے کہ یہ لوگ بہ اصرار تو روک ہی لیں گے، چلو آج سعادت مندی کا رعب گانٹھو: "نہیں نہیں رستم علی صاحب پلیز۔ آخری گانا شروع ہونے والا ہے۔ اس کے بعد سبھی چلتے ہیں۔ ابھی تو رات جوان ہے، آپ اتنی جلدی بور بھی ہو گئے۔"

کچھ دیر سے ہال میں وہی ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا، کچھ غیر ملکی اور کچھ پاکستانی جوڑے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ڈانس کر رہے تھے۔

"ظفر صاحب آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟" کنوارے مردوں کو شادی پر اکسانا عورتوں کا محبوب مشغلہ کیوں ہوتا ہے؟ یہ جھنجھٹوں سے آزاد پھرنے والوں سے اتنا جلتی کیوں ہیں کہ جھٹ سے انہیں پھانس دینے کی فکر کرتی ہیں۔ ان کا احساس غالباً شکار کے بے حد شوقین اس شکاری جیسا ہوتا ہے جو بغیر بندوق کے جنگل سے گزرا جا رہا ہو اور ہر طرف تیتر بول رہے ہوں، اور آس پاس جھاڑیوں سے بھرر بھرر اُڑ رہے ہوں۔ انہیں زندہ اڑتے پھرتے دیکھ کر اس کا دم نکلنے لگتا ہے۔ یا یوں کہ اب ہم تو تمہیں میسر آنہیں سکتے، خود ہی دیر سے پہنچے ہو۔ اب اس کی سزا بھگتو۔ لیکن خیر، اب جو بھی دال ساگ تمہیں مل سکے اس پر گذر کرلو: "آپ جیسی کوئی خاتون ملے تو کر بھی لوں۔" اس فقرے سے یہ سب لوگ اور خاص طور پر رستم علی صاحب چاہیں تو ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں ہی مذاق مذاق میں غلط بات کہہ

گیا۔ میں نے فوراً رستم علی کی طرف دیکھا۔ شاید انہوں نے بات نہیں سنی، چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، بس بت بنے ڈانس دیکھنے میں محو تھے۔ شیخ صاحب زبان لٹکائے ہنس رہے تھے، شمیم کچھ جھینپ سی گئیں۔

یکدم سازوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ گانے والی رنگا رنگ پروں کا اونچا تاج پہنے ہال میں سرکس کے گھوڑے کی طرح میزوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بڑے دائرے میں تیز چلنے کے انداز میں ناچ رہی تھی۔ ایک بہت تیز لے کا گانا گا رہی تھی۔ سامعین گانے کی لے کے ساتھ تالیاں بجا رہے تھے۔ آخر میں کچھ نشے میں دھت لوگوں نے بھنگڑے کے قدم بھی دکھائے جس کا ہمارے سمیت ہائی برڈ جنتری نے بہت برا بھی مانا البتہ امریکن بہت خوش ہوا۔ گانا ختم ہونے پر لوگ ایک پژمردگی اور مایوسی کی سی کیفیت میں آہستہ آہستہ ہال سے نکل رہے تھے۔ لابی میں بل سے آمنا سامنا ہو گیا تو شیخ صاحب نے ہیلو کہہ کر ہاتھ ہلایا: "میٹ مائی وائف ...... اور یہ میرے دوست رستم علی اور ظفر صاحب ہیں۔" رستم علی کی تو باچھیں کھل اٹھیں، آنکھوں میں ایک دم چمک آ گئی۔ عاجزانہ سے چہرے پر اور زیادہ عاجزی چھا گئی۔، جھک کے مصافحہ کیا: "میری بیوی سے ملیے۔"

شمیم نے لمبی لمبی انگلیوں والا گورا گورا ترشا ترشایا ہاتھ بل کی طرف بڑھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک نہایت اوریجنل مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلائی، جو کم از کم میں نے اپنے تین مہینوں کی ملاقات میں ان کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔

انہوں نے مترنم آواز میں بڑی لمبی 'ہاؤ ڈو یو ڈو' کہی۔ وہ بل کے ہاتھ میں دیا ہوا ہاتھ واپس کھینچنے پر کچھ آمادہ نظر نہ آتی تھیں۔ رستم علی گویا ہوئے۔

"میں آپ کے پراجیکٹ پر کام کرتا ہوں۔"

"اوہ تو آپ انجینئر ہیں۔"

"نہیں! میرے وہاں کھدائی اور بجری کی سپلائی کے ٹھیکے ہیں۔"

"اوہ خوب......!"

"میں امید کرتا ہوں کہ آپ کل شام فارغ ہوں گے۔"

"ہاں کوئی خاص مصروفیت نہیں۔"

"تو کل شام یہیں مل کے بیٹھیں گے، گپ شپ رہے گی اور کھانا بھی اکٹھے کھالیں گے۔"

"آپ متردد نہ ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ تو آپ کل شام یہاں ٹھیک ۸:۳۰ تشریف لا رہے ہیں نا؟"

"میں آ جاؤں گا۔"

گفتگو کے دوران شمیم بل کو بہت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی اور کبھی کبھی رستم علی کو بھی اس کارگزاری پر ممتا بھری فخریہ نظروں سے دیکھ لیتیں۔

☆☆☆

میں نے اپنے چوبارے کی کھڑکی کھول کر باہر سڑک پر دیکھا۔ کچھ کالا کالا سا اجالا، کچھ اجلا اجلا سا اندھیرا، ہر طرف پھیلا ہوا یہ احساس پیدا کر رہا تھا جیسے میرا چوبارہ کسی بہت بڑی اور بہت ہی گہری جھیل کے درمیان تہہ میں واقع ہو۔ خاموش کثیف پانی ہر طرف سے مجھ پر مردہ بوجھ کی طرح دباؤ ڈال رہا تھا اور ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ میرے سامنے چھوٹی اینٹ کے ٹوٹے پھوٹے مکان دور تک تاحدِ نگاہ اسی طرح پھیلے تھے جیسے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر کھنڈرات کی صورت میں پانی میں ڈوبے بکھرے پڑے ہوں۔ کھڑکی میں زانوؤں تک اونچا ایک بوسیدہ، بدرنگ لکڑی کا جنگلہ تھا جس میں کبھی زیبائش کے لیے چھ گوشہ سوراخ بنوائے گئے ہوں گے جو اب پھیل کے بدشکل ہو چکے ہیں۔ میں یہ جنگلہ پھلانگ کر باہر چھجے پر کیوں نہ جا کھڑا ہوؤں؟ یہ سوچ کر میں کانپ اٹھا۔ خوف سے میرے پیٹ کی گہرائیوں میں گنجلک زدہ دھاگوں کے بڑے بڑے گچھے پھیل پھیل کے سکڑنے لگے: ”کیا تمہیں یاد نہیں کہ دھچکے والی ایک حرکت، ایک اونچی آواز اس خاموش، ساکت، کثیف، بوجھل مائع، اجالوں اندھیروں، میں لہروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر سکتی ہے کہ وہ لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر تیز سے تیز تر ہوتی جائیں گی اور آخر کار زور پکڑتے پکڑتے اتنی طاقت ور ہو جائیں گی کہ جھیل کو بلو کے رکھ دیں گی، یہ اینٹوں کے پھیلے ہوئے ڈھیر، یہ کھڑکی اور یہ سڑک ان کے بیچ پس کے رہ جائیں گے اور پھر جب طوفان ختم ہوگا تو جھیل کی سطح پر، پرسکون

ہوتی ہوئی لہروں کے درمیان سفید جھاگ بن کر تیرتے ہوئے پھر رہے ہوں گے، خطرے کے اس مکمل احساس کے باوجود میں نے پاؤں سے چپل اتار کر نہایت احتیاط سے جنگلے کے اوپر سے ہولے ہولے ٹانگ گزار کر چھجے پر پہلے ایک پاؤں رکھا، پھر دوسرا رکھا۔ ذرا سا جھک کے نیچے دائیں طرف دیکھا، دور کسی موہوم سے سیاہ نقطے سے شروع ہوتی ہوئی سڑک سرپٹ دوڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی اور شائیں سے چھجے کے نیچے سے گزری چلی جا رہی تھی، جیسے کبھی نہ ختم ہونے والی کوئی تیز رفتار ٹرین۔ یہاں یہ سڑک کہاں سے آ گئی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو چوبارہ غائب تھا، کھڑکی غائب تھی، مع اپنے چھ گوشہ سوراخوں والے جنگلے کے۔ میں ہوا میں چھجے پر کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا، چھجا تبھی میرے پاؤں تلے سے نکل گیا، نہیں میرے پاؤں ہی چھجے پر سے اکھڑ گئے، پتہ نہیں کیا ہوا لیکن جو نہ ہونا چاہیے تھا آخر وہی ہوا۔ گنجلک زدہ دھاگوں کے بڑے بڑے گچھے اور تیزی سے پھیل پھیل کے سکڑنے لگے اور میں نیچے گرتا جا رہا تھا۔ اتھاہ گہرائیوں میں۔ سڑک کہاں چلی گئی؟ وہ اتنی دور تو نہ تھی۔ اب تک تو مجھے تربوز کی طرح دھپ سے ٹکرا کے پھٹ جانا چاہیے تھا۔ اب یہ لہریں کیا کریں گی؟ میں چھجے پر کیوں چلا آیا تھا۔ سڑک تو جنگلے کے اندر رہتے ہوئی بھی ذرا سا جھک کر دیکھی جا سکتی تھی۔ آخر سڑک پر تھا بھی کیا۔ کچھ بھی نہیں، میرے پھیلے ہوئے بازو (مرے ہوئے سکندر کی طرح اپنے بس سے باہر) اور بے قابو ڈھیلی ڈھالی ٹانگیں چکر کھا رہی تھیں، میں ہولے ہولے گھومتا ہوا جا رہا تھا۔ کبھی سر کے بل کبھی پہلوؤں کے بل۔ رضیہ کے گڈے کی طرح جو میں نے ہنسی ہنسی میں کوٹھے پر ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ چکر کھاتا ہوا فضا میں کچھ اونچا ابھرا، پھر ٹانگیں اور بازو واکڑائے پردے کی دیوار کے اوپر سے ہوتا ہوا نیچے نالی میں منہ کے بل جا گرا تھا۔ اس کی تنی ہوئی مونچھیں، اس کی پھٹی پھٹی سیاہ آنکھیں، بارعب بھنویں، سرخ دھاگے سے کڑھے ہوئے ہونٹ سب کالی غلیظ کیچڑ میں لت پت ہو کے ایک ہو گئے تھے: ”اللہ کرے شفیع تو مر جائے۔ اوں اوں شفیع تیرا کچھ نہ رہے، تیرا سیاپا ہو۔“ رضیہ کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ دونوں ہاتھ جن میں لحظہ بھر پہلے گڈا تھا تھا، اب

خالی اور بے بس آنکھوں پر تھے، گڈے کی محبت میں پاگل رضیہ کی سسکیوں میں لپٹی گالیاں میرا پیچھا کر رہی تھیں، میں اب برستی ہوئی نیلی نیلی دھند میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ نالی ابھی نہیں آئی؟ میں گڈا ہوں تو ظفر کہاں ہے۔ اللہ کرے شفیع تو مر جائے۔ تو پھر میں رضیہ ہوں۔ نہیں میں رضیہ اور گڈا ہوں۔ شفیع پھر نکل گیا۔ ہنستا ہوا کھی کھی کرتا ہوا۔

''ظفر!'' میں نے آواز دی۔

''ظفرررررررررررررررررررررررررر۔'' جھیل کے شکم میں کہیں دور چھپی ہوئی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھیلتے سکڑتے گچھوں کے جال میں میرا رواں رواں الجھا جا رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ اور اونچی ہو گئی۔ تُو نے سوئی ہوئی لہروں کو جگا دیا۔ پہاڑوں کی طرح بلند، طوفانوں کی طرح تند و تیز لہریں اب اپنے مسکنوں سے چل پڑی ہیں۔ وہ ابھی سب کچھ پیس ڈالیں گی۔ گڑڑڑڑگڑڑڑڑڑ۔

تجھے اتنا چیخنے کی کیا ضرورت تھی۔ خامشی سے گر رہے تھے گرتے چلے جاتے۔ لیکن وہ تو میرے چھجے سے پاؤں چھٹتے ہی جاگ پڑی ہوں گی۔ اتنے بڑے جھٹکے کی وہ کیونکر متحمل ہو سکتی تھیں؟ اب تک وہ آہستہ آہستہ طاقت اکٹھی کر رہی ہوں گی۔ میرے آواز دینے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا؟ وہ تو جو ہونا تھا پہلے ہی ہو چکا تھا۔ آواز کا کیا قصور ہے؟ چھجے کا قصور ہے۔ چھجے کا قصور ہے؟ ظفر کا قصور ہے۔ ظفر کا کیا قصور ہے؟ گڈے کا قصور ہے۔ گڈے کا کیا قصور ہے؟ شفیع کا قصور ہے۔ شفیع کا کیا قصور ہے؟ رضیہ کا قصور ہے۔ رضیہ کا کیا قصور ہے؟ وہ یہ کہ اس نے گڈا بنایا ہی کیوں۔ مگر رضیہ کا کیا قصور ہے؟ گڑگڑاہٹ اور تیز ہو گئی۔

ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ میں پسینے میں تر بتر ہانپ رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ یہ خواب آخر کو میری جان لے لیں گے۔ کئی مہینے ہو گئے ہر رات باقاعدگی سے اسی طرح ڈراؤنے بھیانک، بے سر و پا خواب دیکھتے ہوئے۔ سرہانے پڑے ٹیبل لیمپ کو روشن کیا۔ اندھیرے کی آغوش سے ایک چمکتا دمکتا کمرہ برآمد ہوا۔ ایش ٹرے سے سگرٹوں کے ٹکڑے ابلے پڑتے تھے۔

کیبرے سے واپس آ کر جو میں نے وہسکی کا گلاس بنایا تھا وہ آدھا بھرا میز پر نہایت انکساری کے انداز میں کھڑا تھا۔ 'یہ شیخ بلانوش ہے اور مجھے بھی خراب کرتا ہے۔ تو پھر تو نے گھر آ کے وہسکی کا گلاس کیوں بنایا؟' میرے سر اور گردن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پلنگ سے پاؤں نیچے لٹکائے تو سامنے روئی کے گالوں کی طرح سفید چھوٹا سا کتا مسکراہٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے زور زور سے دم ہلا رہا تھا۔ میں نے سر ہتھیلیوں میں لے لیا۔ کتے نے دیکھا کہ مالک کوئی نوٹس نہیں لے رہا تو ایک ہلکی سی جست لگا کر میرے پاؤں سے لپٹ گیا: ''نو جیکی۔ نو......نو۔'' جیکی اس تنبیہہ کی پرواہ کیے بغیر اپنی چھوٹی سی گلابی زبان سے میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ اس وقت کتے کے گرما گرم اظہارِ محبت سے مجھے سخت کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میں نے جیکی کو پاؤں سے اٹھا کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے ڈانٹ پلائی: ''گٹ آؤٹ۔''

جیکی شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی ٹانگوں میں دم دبا کر بھیگی بلی بنا پلنگ کے نیچے سٹک گیا۔ میں نے پاؤں سے چپل تلاش کی۔ نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں تو ائیر کنڈیشنر فٹ ہے، وہ تو کھل ہی نہیں سکتی، چپل یہیں کہیں ہوگی، وہ کھڑکی تو میرے گھر کی تھی، میرے فیروز آباد والے گھر کی۔ اس گھر کو چھوڑے تو اب بیس سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ میں کس حال میں ہوں، کہاں ہوں، نہ میں نے کبھی ان کے متعلق جاننے کی کوشش کی ہے کہ کس حالت میں نکلا تھا۔ اسی روز وہ سب میرے لیے مر چکے تھے۔ اب کیا کرنا ہے یہ جان کر کہ کون زندہ ہے اور کون مر گیا۔ ماں جی اگر زندہ ہوتی تو شاید میں اس گھر سے اتنا مکمل قطع تعلق نہ کر سکتا تھا۔ میں نے الماری سے الکاسیلزر نکالی، گلاس لیا، غسل خانے کے نل سے پانی بھرا، سر درد کی دو گولیاں ابلتی ہوئی الکاسیلزر سے کھا کے پلنگ پر لیٹ گیا۔

اب نیند آ جائے تو اس عذاب سے نجات ہو۔ میں نے روشنی بند کر کے نئے لیمپ کی جانب ہاتھ بڑھایا مگر حوصلہ نہ پڑا، اندھیرے کے تصور سے ہی جی گھبرانے لگا۔ آنکھیں

بازوؤں کی اوٹ میں لے کر کروٹ لے لی۔ میں نے کل ایک شام میں ان لوگوں پر فضول
ایک ہزار روپیہ خرچ کر دیا۔ مگر کیا کیا جائے۔ اونچی سوسائٹی میں متعارف ہونے کے لیے
اس سے آسان اور بہتر طریقہ نہیں اور کاروبار میں وسعت تعلقات کے پھیلاؤ پر منحصر ہوتی
ہے۔ میری یہ درمیانی سی فرم اب تقریباً آٹھ دس لاکھ روپے سالانہ منافع کماتی ہے مگر مجھے
صرف اس پر تو نہیں بیٹھ رہنا۔ مثلاً میں اب صنعت لگانا چاہتا ہوں جو تجارت کی نسبت کہیں
زیادہ تیزی سے روپیہ کماتی ہے اور جس میں آگے بڑھنے اور ترقی کے مواقع بھی زیادہ ہوتے
ہیں۔ بڑا صنعت کار بننے کے لیے سرمائے کے علاوہ اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً
سرکاری افسروں اور بڑے بینکاروں سے بے تکلف دوستانہ مراسم، اونچے درجے کے
صنعت کاروں سے جان پہچان وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یقین ہے اگر اے۔ بی شیخ اور رستم علی کے
خاص دوستوں کے زمرے میں اپنا مقام پیدا کرلوں تو یہ مراحل جلد اور آسانی سے طے کر سکتا
ہوں۔ ان لوگوں کی ان اونچے حلقوں میں جہاں کام نکلتے ہیں، اچھی خاصی واقفیت ہے۔
اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا اور جب دیکھوں گا کہ یہ میرے زیادہ سودمند نہیں رہے تو
ان سے کٹ کے الگ ہو جاؤں گا۔ دیکھو آج شام رستم علی مجھے مسٹر بل کی پارٹی پر مدعو کرتا
ہے یا نہیں۔ اگر نہ بھی کرے تو کیا ہے میں اس چھوٹی سی بات کے لیے ابھی ان لوگوں کو
چھوڑنا برداشت تو نہیں کر سکتا۔ یہ شمیم بڑی تیز عورت ہے، کل شام کیسے مسٹر بل سے چپکی
جیسے مدتوں کی جان پہچان ہو۔ تین بچوں کی ماں ہے لیکن ابھی بھی بدن میں بڑی سکت ہے۔
چہرے میں تو پوری پوری جاذبیت برقرار ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر سے ادھر ادھر جو کہیں شہ پڑی
ہے اسے اپنے نخرے ٹھسکے سے خوب متوازن کر لینے کا گر جانتی ہے۔ میرے خیال میں تو بے
چارے رستم علی اتنا کاروبار پھیلانے کی اہلیت کہاں رکھتے تھے۔ یہ بیشتر شمیم کی عشوہ گری کا
اعجاز نظر آتا ہے۔ اطمینان سے تکیے پر دھرے ہوئے پرسکون چہرے پر ایک شرارت بھری
مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اگر شمیم جیسی کسی عورت سے شادی کرلوں تو کیسی رہے گی؟ مجھے ان
ہتھکنڈوں کی کیا ضرورت ہے۔ میں اگر کسی شمیم کی مدد کے بغیر کپاس برآمد کرنے والی ایک

فرم کے لاوارث دیہاتی کلرک کی حیثیت سے ابھر کر ایک کپاس برآمد کرنے والی فرم کا
مالک بن سکتا ہوں تو آئندہ اپنے زورِ بازو پر ایک کامیاب صنعت کار بھی بن سکتا ہوں۔
کہاں وہ فیروز آباد جہاں چند ہزار کی سالانہ آمدنی ہوا کرتی تھی۔ میاں جی سال میں دو بار
ایک پھٹیچر سی گھوڑی پر سوار ہو کر قریبی دیہات میں مزارعوں سے بٹائی وصول کرنے جاتے
اور دو تین دن بعد وہاں سے لوٹتے تو گھر میں ہر شخص ان کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری سوتیلی
ماں، میرے دو سوتیلے بھائی ان کی بیویاں، رضیہ، میری ماں، غریب رشتے دار، نائی دھوبی
کتنے لوگوں کا انحصار ہوتا تھا اس مختصری رقم پر۔ زمین ایک کنجوس تھیلی کی طرح سال میں صرف
دو مرتبہ گھٹا گھٹایا سا منہ کھولتی تھی۔ اس قلیل آمدن میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے لیے
وہاں کیا کیا سیاستیں چلی جاتی تھیں۔ میں اور رضیہ پہروں دروازوں کے پیچھے چھپے دڑاروں
میں لڑائی جھگڑا اور تو تکار ہوتی دیکھتے رہتے۔ میری ماں کہنے کو تو آدھے حصے کی دعویدار ہوتی
تھی اور بقیہ آدھے میں میری سوتیلی ماں کے پورے خاندان کو گزر اوقات کرنے کے لیے
کہتی لیکن در حقیقت چاہتی یہ تھی کہ میاں جی کو بہلا پھسلا کر یا دھونس دھڑلے سے ان سے
زیادہ سے زیادہ رقم ہتھیا لے۔ دوسرے فریق کا موقف یہ ہوتا تھا کہ تمام آمدنی کے تین برابر
حصے کیے جائیں، تین بیٹوں کے لحاظ سے ایک حصہ میری ماں کو ملے اور دو حصے میری سوتیلی
ماں کو اور میاں باری سے ایک دن ہمارے ہاں اور ایک دن سوتیلی ماں کے ہاں کھانا
کھائیں اور کچھ رقم وہ اپنے اخراجات کے لیے بے شک الگ لے لیا کریں لیکن تمام حساب
ہونا سب کے سامنے چاہیے نہ کہ میاں جی چوبارے میں بیٹھ کر حصے تقسیم کر کے لے آئیں جو
کہ میری، میاں جی اور میری ماں کی رہائش گاہ تھا، کیونکہ ان کا خیال تھا (اور درست خیال
تھا) کہ اس طرح میری ماں بہت سی رقم پہلے سے ہی خرد برد کر جائے گی جو میاں جی نہ تو
بتانے اور نہ اس سے اگلوانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ دونوں فریق اپنے اپنے تقسیم کے اصولوں
پر مضبوطی سے ڈٹے رہتے اور اپنے مطالبوں سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو آمادہ نہ ہوتے
تھے۔ میاں جی حد درجہ حلیم، متین اور کم گو طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کسی سے بے انصافی نہیں

کرنا چاہتے تھے مگر اپنا حق زور سے منوانے کے اہل بھی نہیں تھے، اس لیے میری ماں ہمیشہ زیادہ حصہ لے جاتی اور چیختی بھی سب سے زیادہ۔ میرا بھائی خاص طور پر میری بھابیاں، میری ماں کی دھاندلیوں پر پرزور احتجاج کرتیں، بھائی آخر پاؤں پٹختے بلند آواز میں بولتے باہر چلے جاتے، بھابیاں دوپٹے آنکھوں پر رکھے ڈسکتی رہتیں۔ ماں فاتحانہ انداز میں چوبارے اور چوبارے کے سامنے پھیلے ہوئے صحن کے درمیان گھر کے کام کاج میں مشغول آتی جاتی، میاں جی کو کہہ رہا ہوتی، ''میں اگر کچھ نہ بولوں تو تم سب کچھ اٹھا کر انہیں کو دے دو اور ہمیں بھوکا مار دو۔ دیکھ لو! یہ لوگ تمہاری زندگی میں میرا اتنا برا حال کرتے ہیں تو تمہاری موت کے بعد تو خدا جانے میرا کیا حشر کریں گے۔ ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ میرا چھوٹا سا بچہ ہے کچھ زمین میرے نام لگوا دو مگر تم کچھ سنتے ہی نہیں۔'' پھر زار و زار رونے لگتی، میاں جی عینک لگائے چارپائی پر دبکے خاموشی سے کتاب کے ورق الٹتے رہتے۔ دل میں خدا معلوم کیا سوچتے ہوں گے، ان کے چہرے سے کچھ عیاں نہ ہوتا۔ جب یہ ڈرامہ ان کی برداشت سے بالکل باہر ہو جاتا تو ہاتھ میں کھونڈی پکڑے، سر ہلاتے احتیاط سے قدم قدم سیڑھیاں اتر جاتے۔

میں نے اپنی سوتیلی ماں کو کبھی کسی جھگڑے میں بھی حصہ لیتے نہیں دیکھا، وہ پیڑھی پر خاموش بیٹھی رہتی اور اگر میاں جی وہاں ہوتے تو اپنے سفید بغیر کلف کے دوپٹے کو سر پر سے نیچے کھسکا کر ماتھا بھی پوری طرح ڈھانپ لیتی اور ان کی موجودگی میں کبھی غلطی سے بھی نظر اونچی نہ کرتی۔ اس نے مجھ میں اور رضیہ میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا۔ میری ماں سامنے نہ ہوتی تو مجھے خوب لپٹا لپٹا کر پیار کرتی، محبت سے کھانا کھلاتی۔ رضیہ سے جھگڑا ہو جاتا تو شفقت سے سمجھاتی کہ دیکھو یہ تیری بھتیجی ہے چھوٹی سی پیاری سی بھتیجی، اسے مارا نہ کر، میں بھی اس سے اس طرح ضد کر کے پیسے مانگتا تھا جیسے میری اپنی ماں ہو، کوئی شفیق بزرگ ہو۔ بڑی بھابی نے کبھی مجھے آنکھ میں جگہ نہ دی تھی اور نہ میری کبھی یہ جرأت ہو سکی تھی کہ اس کے نزدیک پھٹک جاؤں اگرچہ چھوٹی بھابی سے خوف نہیں آتا تھا لیکن اس کے بھی روکھے

رویے کو دیکھ کر مجھے کبھی میل جول بڑھانے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ میں اپنے ہوش سنبھالنے کے دن سے لے کر فیروز آباد کی زندگی کے آخری دن تک مختلف لوگوں سے مختلف رنگ ڈھنگ میں ایک بات سنتا رہا تھا کہ میری شکل اپنی سوتیلی ماں سے ہو بہو ملتی ہے۔ لوگ بڑی کٹیلی ہنسی ہنستے ہوئے بہت معنی خیز استعجاب کا اظہار کرتے کہ بچوں کی شکل اپنے والدین سے ملتی ہے یا بہن بھائیوں سے ملتی ہے، کسی کو اپنی سوتیلی ماں پر پڑتے نہیں دیکھا۔ واقعی میری صورت اپنی سوتیلی ماں سے بہت ملتی تھی، اور اپنی اصلی ماں، باپ اور بہن بھائیوں سے قطعی مختلف تھی۔ وہی چوڑی چپٹی، بھدی ناک وہی پھیلا ہوا دہانہ، وہی گھنگریالے بال، وہی چہرے کا کٹاؤ، وہی سانولا رنگ، وہی ماتھے کے وسط میں مسا، وہی سیاہ روشن آنکھیں اور اب وہی لمبا قد اور وہی دوہرا جسم۔ وہ جب رضیہ کا گڈا نالی میں گرا تھا اور رضیہ کی ماں نے نیچے صحن میں کھڑے ہو کر بازو لمبا کر کر کے مجھے کوسنے دیے تھے اور میری ماں نے جواباً پہلے چھت کی حفاظتی دیوار سے نیچے دیکھتے ہوئے گالیوں کا طومار باندھ دیا تھا اور پھر جب بات اور بڑھ گئی تو وہ بھی نیچے اتر آئی تھی۔ سب ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد سے بھری تو ہر وقت رہتی تھیں، یہ ذرا موقعہ بنا تو پھٹ پڑیں۔ خوب جی کھول کر ایک دوسرے کے میکے والوں کو گالیاں دی جا رہی تھیں۔ میری سوتیلی ماں بڑی بھابی کا بازو پکڑ کے کھینچ رہی تھی: ''اے بہو! خدا کے لیے تو ہی جانے دے۔ دنیا سنے گی تو کیا کہے گی۔ چل میری بیٹی اندر۔''

رضیہ جو فریادی تھی وہ اپنا دعویٰ اور رونا دھونا بھول کر اپنی خوفزدہ آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ لیے ستون سے کمر لگائے خاموش کھڑی حیرانی سے سب ہوتا دیکھ رہی تھی جو اس کی سوچ اور سمجھ سے بہت باہر تھا۔ میں ڈیوڑھی کے ایک اندھیرے کونے میں منہ دیے ہوا کھڑا اپنے پورے بدن سے زور لگا رہا تھا کہ یہ دیوار پھٹ جائے تو میں اس کے اندر سما جاؤں۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔

سوتیلی ماں نے چیختے ہوئے بھابی سے کہا: ''بہو! کیوں میرے سفید چونڈے میں

راکھ ڈالنے پر تلی ہے۔ تو ہی عقل سے کام لے، اندر چلی جا!"

بھابی نے زہر میں بجھی ہوئی بغلی چھری چلائی: "مجھے منع کرتی ہیں اسے کچھ نہیں کہتیں جو بھونکے جا رہی ہے۔ ہاں ہاں تُو تو اس مرجانے شفیع کی حمایت کرے گی ہی، تیرا تو وہ کچھ لگتا ہے نا۔"

تیر نشانے پر بیٹھا۔ میری ماں تلملا اٹھی لیکن بات بدل کر وار کیا: "میرے بھائی کو کہتی ہے کہ جیل میں ہے۔ وہ لڑ کر جیل گیا، مرد ہے مرد، اپنی بہن کو سنبھال جو گاؤں کے میراثی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

اتنی بڑی بے عزتی کا جواب نہ دینا بھابی کے بس کے باہر تھا۔ ایک بات جو وہ اتنی دیر میں اشاروں میں ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ سب بند توڑ کر بلا جھجک اس کے ہونٹوں پر آ گئی: "اے بی بی ذرا اپنی چارپائی تلے ڈنڈا پھیر۔ میری بہن تو میراثی کے ساتھ بھاگ گئی تھی نا، تُو نے تو میرا خاوند مجھ سے چھینا ہوا ہے، سوتیلے بیٹے سے یارانہ لگایا ہوا ہے۔ شرم ہے تو کہیں ڈوب مر۔" اسی کے بیج سے پیدا کر کے اس کے سامنے شریک کھڑا کر دیا ہے۔"

بھابی نے ابھی فقرہ مکمل نہ کیا تھا کہ بڑا بھائی میرے پاس سے گزر کر اندر صحن میں کھڑا تھا۔ میری ماں دونوں ہاتھوں سے چھاتی اور رانوں پر پیٹ رہی تھی اور زار و قطار روئے جا رہی تھی: "ہائے میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں، مجھ پر ایسی تہمت؟ غلام احمد اس گشتی رَن کو سمجھا لے، نہیں تو خون ہو جائیں گے۔"

بھائی نے کسی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، ڈنڈا اٹھایا اور بھابی کو دھوادھو پیٹنا شروع کر دیا۔ میاں جی باہر سے آئے اور ڈیوڑھی کے کونے میں مجھے دبکا دیکھا تو بازو سے پکڑ کر مجھے اپنی ٹانگ سے لپٹاتے ہوئے اندر صحن میں لے آئے۔ میں سہا ہوا ان کی ٹانگ سے چمٹا کھڑا تھا۔ میری ماں دیکھتے ہی ان پر غصیل بھڑ کی طرح حملہ آور ہوئی۔ ان کے کرتے گریبان کو دونوں مٹھیوں میں زور سے بھینچ لیا: "دیکھ لو! یہ کتیاں کتنیاں مجھ پر کیا تہمتیں لگاتی ہیں، ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے الگ مکان بنوا دو، میں آج تمہیں مار ڈالوں گی یا انہیں مار دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دھکا جو دیا میاں جی دیوار سے جا ٹکرائے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی ان کے سر سے پھسل کر آدھی کان پر آ رہی۔ میں نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر اب بھی وہی صبر و شکر پھیلا تھا۔ آدھی پگڑی میں پھنسا سر بے بسی سے ہل رہا تھا۔ شام کے پھیلتے دھندلکوں میں پڑوسی منڈیروں پر سے نیچے تماشا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ تماشا دیکھنے والی پوری دلچسپی اور لاتعلقی سے میری سوتیلی ماں نے دوڑ کے جا کے میاں جی کی ڈھلکی ہوئی پگڑی ان کے کندھے سے اٹھا کر ان کے سر پر رکھی۔ انہوں نے اتنا کہا: "غلام احمد! نہ مار لڑکی کو نہ مار۔" اور سیڑھیاں چڑھ گئے۔

آج ان لوگوں کو میری آمدن کا علم ہو تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔

دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا: "صاحب جی! چائے۔"

"لے آؤ دینو!"

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ پھرتی سے بستر سے اٹھا اور سڑ سڑ چائے پینے لگا۔

☆☆☆

میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب دفتر سے گھر پہنچتا۔ دینو میری آمد سے گھنٹہ ڈیڑھ پہلے ایئر کنڈیشنر چلا دیتا، کمرہ خوب ٹھنڈا ہو رہا ہوتا اور میں سیدھا بستر میں گھس جاتا۔ دو گھنٹے کے قریب سو کے اٹھتا تو آہستہ آہستہ کلب جانے کی تیاری شروع کر دیتا۔ پانچ بیڈ روم کے اس لمبے چوڑے بنگلے پر ہر وقت اداسی برستی رہتی۔ دینو کے علاوہ دو نوکر اور موجود رہتے لیکن اتنے بڑے گھر میں تین اونگھتے ہوئے نوکر زندگی کا تاثر کیا پیدا کر سکتے تھے۔ میں بیشتر وقت باہر رہتا۔ یہ گھر میرے لیے محض سونے کی ایک جگہ تھی یا میرے سرمایہ دار ہونے کا ایک ثبوت تھا۔ اس شہر میں جہاں گھاس کی ایک پتی اگانے کے لیے پورے باغ کی نگہداشت جتنا اہتمام کرنا پڑتا وہاں میرے گھر کا وسیع سرسبز لان رنگا رنگ پودوں سے اس طرح مزین رہتا کہ آنے والا محسوس کرتا کہ گویا وہ کمپنی باغ کے کسی گوشے میں پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس لان میں کوئی آیا کب؟ میں خود بھی کبھی نہیں بیٹھا، وہ تو محض میرے دولت مند اور خوش ذوق ہونے کا خاموش اعلان تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے کاریں بھی تین رکھی ہوئی تھیں، اگرچہ میری ضرورت کے لیے ایک کار بہت کافی تھی۔ اصل میں جب تک دولت جتلائی نہ جائے اس کے ہونے کا لطف آدھا بھی نہیں رہ جاتا۔ بڑے شہروں میں پاس پاس رہنے والے ایک دوسرے کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیا کرتے۔ لیکن میرے پڑوسی اس گھر کی مستقل خاموشی سے آخر متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک دو نے تو

خاص طور پر کوشش کر کے دینو سے دریافت کیا کہ میاں یہاں کون رہتا ہے۔ دینو کے بتانے پر انہیں اس پراسرار شخصیت کے بارے میں اتنا تو معلوم ہو گیا کہ کوئی کاروباری شخصیت ہے جس سے ان کی ایک گونہ تشفی سی ہو گئی کہ اس امر کا بہت کم امکان ہے کہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ ان کے پڑوس میں ہو جس سے ان کے احساس کو دفعتاً دھچکا پہنچے یا جو اُن کی اس آبادی کے سماجی وقار کے منافی ہو۔

تولیہ کمر سے باندھے شیشے کے سامنے کھڑا غور سے اپنے بدن کا جائزہ لے رہا تھا۔ توند کی قوس ذرا سی زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ کپڑوں کے اندر رہنے والا جسم چہرے اور بازوؤں کی نسبت قدرے ہلکے رنگ کا تھا۔ یہ لباس ایجاد کرنے والا بھی کوئی بڑا عیار آدمی ہوگا، غالباً کوئی ڈھلتی عمر کی عورت ہوگی، کہ کس صفائی سے اپنی بدصورتی چھپانے کا اہتمام کر لیا۔ آج دن بھر وقفوں وقفوں سے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتی رہی ہو کہ یہ شمیم اور رستم علی مجھے ڈِل کے کھانے پر مدعو کرتے ہیں یا نہیں۔ آخر پانچ بجے تھک کر گھر آ گیا۔ مگر ان دونوں کی آواز ٹیلیفون پر نہ سنائی دینی تھی اور نہ دی۔ بڑے خود غرض لوگ ہیں۔ ڈرتے ہوں گے کہ کہیں میں نہ اسے لے اڑوں۔ بھلا ڈِل کوئی بکری ہے کہ میں اسے کان سے پکڑ کر کسی ٹیلے کی اوٹ میں الگ لے جا کر اس کی دھاریں لے لوں گا اور جب یہ دو ہنے بیٹھیں گے تو چرمر سوکھے تھنوں کے علاوہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ یہ امریکن بڑے کائیاں لوگ ہوتے ہیں، دودھ تو کیا یہ تو تھن بھی گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔ کیا خبر اے۔ بی شیخ اور ریحانہ کو بلایا ہے یا نہیں۔ اگر انھیں بلاتے ہیں تو مجھے اور زیادہ دکھ ہوگا۔ خیر! یہ تو ابھی کلب پہنچتے ہی پتہ لگ جائے گا کہ ان کی بھی گریڈنگ کیا ہے۔ قمیص کا کالر درست کر کے ٹائی لگائی، گردن اِدھر اُدھر ہلا کے جائزہ لیا۔ ذرا پیچھے ہٹ کر آئینے میں دیکھا۔ بغیر پتلون کے سیاہ بالوں سے بھری ہوئی ننگی ڈنڈا سی ٹانگیں۔ عجیب ہیئت ہے۔ اسی طرح باہر چلا جاؤں تو ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ پلنگ پر چڑھ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں ٹانگیں سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر گھٹنے اکٹھے کر کے کانوں کے نزدیک کر لیے اور آہستہ آہستہ پاؤں پر موزہ چڑھانے لگا۔

آئینہ پر نظر پڑ گئی۔ یہ عجیب جانوروں کا سا پوز ہے بیٹھنے کا، مگر جانور تو اس پوز میں کبھی نہیں بیٹھتے۔ ہاں وہ کبھی موزے بھی تو نہیں پہنتے نا، جانوروں کے بیٹھنے کو تو چند ایک پوز ہیں مگر بھی باوقار۔ خاص طور پر بلی کے بیٹھنے کا وہ پوز کتنا شاندار ہوتا ہے جس میں وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر زمین پر بیٹھتی ہے اور دم لہراتے ہوئے ربن کی طرح اس کے نیچے سے نکل کر اس کی ٹانگوں کے قریب سے پیچ کھاتی ہوئی اس کی پشت سے لگتی ہوئی پیچھے نکل جاتی ہے۔ اگلی دو ٹانگیں زمیں سے کندھوں تک سیدھی اٹھتی جاتی ہیں۔ ان پر سیدھی جاتی ہوئی لمبی بارعب گردن اور اس پر سامنے دیکھتا ہوا ایک پرتمکنت چہرہ۔ اس پوز میں ایسا دبدبہ ہوتا ہے جیسے کوئی ملکہ انصاف کرنے کے لیے دربار لگائے بیٹھی ہو اور سامنے فریادی رعایا کے ٹھٹھے لگے ہوں۔ کتے بھی اس پوز میں بیٹھتے ہیں لیکن وہ یہ شان پیدا نہیں کر سکتے۔ ان پر ایک مظلومیت سی برس رہی ہوتی ہے۔ شاید مظلومیت وفا کا ایک خاصہ ہے یا مظلوم وفا پسند بن جاتے ہیں:

''صاحب جی!'' دینو کی آواز آئی، میں چونک گیا جیسے کوئی گناہ کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔ خود حفاظتی کیلیے تحکمانہ آواز لگائی: ''ٹھہرو!'' اور پتلون کی طرف لپکا لیکن پھر سوچا نوکر ہی تو ہے سن لیتا ہوں بات۔ اپنے مالک اور اس کے نوکر ہونے کے احساس کو اپنے ذہن میں اچھی طرح جذب کرنے اور اس حیثیت کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اور یہ سمجھنے کے لیے کہ اب میں اس کا فائدہ اٹھا رہا ہوں، پتلون کو حد درجہ اطمینان کے ساتھ جھاڑا، نہایت آہستہ آہستہ پہنا، مزے مزے سے بٹن لگائے پھر کہا: ''آ جاؤ۔'' اور لش لش کرتے بوٹ پہننے میں مشغول ہو گیا۔

''جناب وہ......''

''کیا ہے؟''

''خانساماں چھٹی مانگتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس کی ماں مر گئی ہے۔ تار آیا ہے''

''ناشتہ کون تیار کیا کرے گا؟ تم کر لو گے۔''

''جی ہاں!''

''کتنے دنوں میں آ جائے گا؟''

''کہتا ہے کہ ہفتہ دس دن میں آ جاؤں گا۔''

''اچھا! جائے۔''

''وہ جناب کچھ پیسے بھی مانگتا ہے۔''

''جتنے دنوں کی تنخواہ کے پیسے بنتے ہیں، لے لے۔''

''نہیں جناب! وہ کہتا ہے کہ سو روپیہ دے دیں پھر کاٹتے رہیے گا۔''

''دینو! فالتو پیسے جو لے کر گیا ہے وہ کبھی واپس آیا ہے، ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا۔''

''اس بار موقع ہی کچھ ایسا آن پڑا ہے، آپ مہربانی کر دیں۔''

''روپے دے دیتا ہوں لیکن یہ دیکھ لو اگر وہ واپس نہ آیا تو تمہاری تنخواہ میں سے کاٹ لوں گا۔''

دینو سو روپیہ لے کر چلا گیا۔ میں نے میز سے کار کی چابی اٹھائی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھری کاش یہ تار میری ماں کے مرنے کا آیا ہوتا۔ کیا خبر ہو کہ وہ مر ہی چکی ہو؟ یہ میرا یقین ہے کہ اس کی موت مجھ سے چھپی نہ رہے گی، کسی نا کسی حیلے بہانے سے خود ہی پتہ چل جائے گا۔

کلب کے سبز لان کے ساتھ ساتھ مڑتی ہوئی سڑک پر میری گاڑی پھسلتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لان میں ذرا ذرا فاصلے پر روشنی کے بڑے بڑے دھبوں کے نیچے لوگ دائروں میں بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر سے کوئی ابھرتا ہوا قہقہہ، کوئی جلترنگ کی طرح ٹنٹناتی ہوئی ہنسی سنائی دے جاتی، ان دھبوں کے درمیان اور کلب کی عمارت اور لان کے درمیان بیرے دور سے بے مقصد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی بڑے ریلوے اسٹیشن کو بلندی سے دیکھیں تو میدان پھیلی ہوئی، الجھی ہوئی لائنوں پر شنٹنگ کرتے ہوئے انجن، ڈبے، ویگن بلا مقصد اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر رول کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میں نے ایک نظر دوڑائی، چند ایک شناسا چہرے نظر آئے مگر ریحانہ اور اے۔ بی شیخ تو وہاں نہیں تھے۔ دوبارہ نظر دوڑائی، سوچا ممکن ہے کلب کے اندر ہوں یا ممکن ہے انہیں رستم علی اور شمیم نے بل کے کھانے پر مدعو کیا ہو۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ آج شام کہیں اور مدعو ہوں یا پھر گھر پر ہی ہوں، شاید...... ''یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں یقین ہے کہ وہ رستم علی ہی کے ساتھ ہوں گے اور اس حقیقت کو اپنے آپ سے چھپانے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کر رہے ہو۔'' گاڑیوں کے باڑے میں گاڑی کھڑی کی، تالہ لگایا، ٹائی درست کی۔ تین چار ڈرائیور ایک اندھیرے کونے میں کھڑے یوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے جیسے چور نقب لگانے کا پراگرام بنا رہے ہوں کہ میں اوپر سے پہنچ گیا اور گھبراہٹ میں انہیں خاموش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کلب ان کے صاحبوں کی تفریح کی جگہ تھی، ان کی تفریح کی نہیں اور وہ چوری ہی کر رہے تھے۔ تفریح کی چوری۔ روشن برآمدہ، چمکتا ہوا فرش، چوپٹ کھلا ہوا گیلری کا بڑا دروازہ، شیڈوں سے چھن کے آتی ہوئی جھینپی جھینپی ہوئی روشنی، دور تک جاتی ہوئی گیلری کی پوری لمبائی میں بچھا ہوا نیلا قالین۔ وہ اتنا گہرا تھا جیسے اسے رات کو خون میں رنگا گیا ہو۔ کندھے سے ذرا اونچائی پر دونوں طرف گیلری کی زرد دیواروں پر تصویریں لگی ہوئی تھیں جنہیں کبھی کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ لکڑی کے بہت بوجھل فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر کے پاس رک گیا: ''۱۹۲۵ء میں مسٹر اے۔ بی جونز آئی سی ایس صدر کلب کی الوداعی تقریب کے موقع پر۔ کچھ سروں پر لپٹی ہوئی بڑی بڑی پگڑیاں ہیں، لمبے لمبے کوٹ ہیں، لہراتی ہوئی مونچھیں ہیں، انگرکھے ہیں، شیروانیاں ہیں، بٹر فلائی کالر اور ٹائیاں ہیں، سیاہ رنگ کی گول سپاٹ ٹوپیاں ہیں، تنگ پاجامے ہیں، پھندے دار ترکی ٹوپیاں ہیں، درمیان میں مسٹر اے۔ بی۔ جونز گود میں ہیٹ لیے ٹانگ پر ٹانگ دھرے کرسی پر بیٹھے ہیں اور ایک ناتمام سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل رہی ہے۔ لوگ دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے ہیں یا ان کے پیچھے ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ یہ الوداعی تقریب میں آئے تھے، یا کسی فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے آئے تھے؟ سب کی

سب آنکھیں کیمرے کو دیکھ رہی تھیں، اور کیمرے کے پیچھے سیاہ کپڑے سے باہر دو انسانی ٹانگیں اس طرح مصروفِ حرکت ہیں جیسے وہ کیمرے سے باہر نکل آئی ہیں، اور باقی بھیڑ کو باہر کھینچ نکالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ شخص تو کیمرے سے نکل کر کہیں بھاگ گیا مگر یہ آج تک بیٹھے اسی کو تکے جا رہے ہیں، مسٹر اے۔ بی۔ جونز مسکرائے جا رہے ہیں۔ ۱۹۲۵ء کی ایک شام سے لے کر اب تک اور خدا جانے کب تک اسی طرح مسکراتے رہیں گے۔

میں نے اخبار میں ایک مقتول کی تصویر دیکھی تھی، خنجر کی ضرب کا پورا درد و کرب اور زندہ رہنے کی انتہائی تمنا پوری شدت سے زمین پر دوہرے ہو کر پڑے اس انسان کی پھٹی آنکھوں میں جمع ہو گئے تھے۔ میں نے اخبار کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دفتر چلا تو وہ میرے لان میں پڑا تھا۔ دینو سے کہا کہ اسے باہر پھینک دو۔ راستہ بھر جگہ جگہ وہ پڑا تھا۔ تصویر کھینچنے والے نے اس پر قاتل سے بڑھ کر ظلم کیا۔ خنجر کا درد تو لمحے بھر کے بعد ختم ہو گیا ہو گا مگر وہ تا قیامت اپنی اس تصویر میں اسی درد و کرب اور دکھ میں مبتلا رہے گا اور زندہ رہنے کی بھیک مانگتا رہے گا۔ مسٹر اے۔ بی جونز اپنے وقت کے مسٹر بل تھے اور باقی اپنے وقت کے رستم علی تھے لیکن شاید ابھی شیمپئن باہر نہیں نکلی تھی۔ میں بھی کیا رستم علی کے پیچھے پڑ گیا ہوں، ایک کاروباری دعوت ہے جس میں اگر مجھے نہیں بلایا تو کون سی ایسی آفت آ گئی۔ بلا وجہ اپنے کو کچوکے دیے جا رہا ہوں۔ آخر ان بے چاروں کو اتنا حق بھی نہیں کہ میرے بغیر اپنے کسی مہمان کی میزبانی کر سکیں۔ میرا ان پر کیا حق ہے؟ یہی کوئی چند مہینے پرانی واقفیت ہے اور بس۔ سامنے ایک سیاہ سوٹ کے ساتھ سفید جھلملاتی ساڑھی چلی آ رہی تھی۔ گلابی رنگ گلاب کے شگوفوں جیسی ایڑیاں سفید سینڈل سے باہر جھلک رہی تھیں۔ سیاہ بازو، کندھے پر پڑے سفید پلو پر ذرا اٹکا، پھر بلوریں کمر پر رکا اور واپس مالک کے پہلو میں آ رہا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے یونہی ایک دوسرے سے بدن چھوا رہے تھے۔ جیسے سردیوں کی راتوں میں چھتوں پر کوئی بلیوں کا جوڑا دُمیں ہوا میں بلند کیے گھوم پھر کے ذرا ذرا بہانے بنا کے ایک دوسرے سے نرم و ملائم ریشمی بدن زور زور سے رگڑ رہے ہوتے

ہیں۔ بدن نہ ہو تو جذبات واحساسات کا کوئی وجود نہ ہو، ہم بدن ہیں اور بدن ہم ہیں۔

سمندر کی طرح اتھاہ، وسیع، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جذبات اپنا بدن قبول کروا کے اور دوسرا بدن قبول کر کے اظہار وتسکین کی راہ پاتے ہیں۔ ہم کس طرح پکارتے ہیں، چیختے ہیں کہ ہمارا بدن قبول کر لو۔ کس طرح تڑپتے ہیں، پھڑکتے ہیں کہ دوسرا اپنا بدن ہمیں سونپ دے۔ محبوب کو لپٹا کر اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے ہیں اور خود اس کے اندر جذب ہو جانا چاہتے ہیں لیکن جو بدن اس سب پکار، چیخ، تڑپ، پھڑک رکھنے کے باوجود نہ اپنا بدن قبول کروا سکتا ہو اور نہ دوسرا بدن قبول کر سکتا ہو تو وہ کیا کرے۔ بدن واپس کر دے، نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی بدن واپس نہیں کر سکتا، میں نے اپنے آپ کو پورا موقع بھی تو نہیں دیا۔ جنسِ مخالف ہمیشہ مجھے متوجہ کرتی رہی ہے۔ عورتوں میں میری دلچسپی ہمیشہ برقرار رہی ہے۔ حسین چہرہ دیکھ کر اسے اپنانے کی کی تمنا اب بھی قائم ہے۔ صرف قائم ہی نہیں ہے بلکہ اتنی شدید ہوتی ہے کہ میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ یہ غلط ہے کہ میں اپنا بدن قبول نہیں کر سکتا، یہ بہتان ہے کہ میں دوسرا بدن قبول نہیں کر سکتا۔ حمیدہ بچپن میں رضیہ کے ساتھ گڑیاں کھیلنے کے لیے روزانہ ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ ان دونوں میں بہت پیار تھا۔ جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک سہ پہر جب میں سکول سے واپس آیا تو رضیہ اور حمیدہ آنگن کے ایک کونے میں چارپائی پر سر جوڑے بیٹھیں نہایت انہماک سے باتیں کر رہی تھیں۔

انہوں نے اپنے سر اور سینے اچھی طرح دوپٹوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ تین چار سال بعد پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اچھا تو اب حمیدہ یہ ہے، زندہ ہے۔ میں تو اس کی ہستی سے قطعی غافل تھا۔ آج تک مجھے کبھی یہ خیال نہ گزرا تھا کہ حمیدہ بھی کوئی چیز تھی جو باقاعدگی سے آیا کرتی تھی پھر اس نے دفعتاً آنا بند کر دیا تھا۔ اب جوان ہو کر نکلتے ہوئے قد کی، بھرے جسم والی، صحت مند، سانولے رنگ کی، پکار پکار کر متوجہ کرنے والی دوشیزہ بن چکی تھی۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔

"حمیدہ! تم آج ادھر کیسے آنکلیں؟"

"چاچا! یہ بی بی سے کروشیا سیکھنے آیا کرتی ہے۔" رضیہ نے مجھے بتایا۔

حمیدہ نے ایک بار اپنی لمبی پلکوں والی رس بھری سیاہ آنکھوں سے اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی، پھر آنکھیں جھکا کر اور سمٹ کے بیٹھ گئی۔

"حمیدہ کیسی ہو؟"

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے، رضیہ کہنے لگی: "چچا شفیع آپ جائیں، ہم نے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور اس نے ابھی واپس چلے جانا ہے، ایمان سے آپ جائیں۔"

میں نے سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر دفعتاً پلٹ کے دیکھا تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

میرے دل میں ایک میٹھی میٹھی سی آگ سلگنے لگی، میں ایک نئے جذبے سے آگاہ ہوا۔ ہر وقت آنکھوں کے سامنے حمیدہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ پڑھائی سے جی اچاٹ ہو گیا۔ نمازیں پڑھ پڑھ کے دعائیں مانگتا کہ یا اللہ حمیدہ کسی طرح مجھے مل جائے۔ چھٹی ملتے ہی سکول سے تیر کی طرح گھر آتا کہ کہیں دیدار سے محروم نہ رہ جاؤں۔ امتحان میں چونکہ دو تین ماہ کا وقفہ رہ گیا تھا اس لیے ایک ماسٹر صاحب نے چھٹی کے بعد روک لیا کہ آج سے سکول ختم ہونے کے بعد بھی ایک پیریڈ لیا کروں گا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، یہ کیا مصیبت آئی کہ اب حمیدہ کو روز دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا کرے گا۔ فارغ ہوتے ہی میں گھر کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔ ڈیوڑھی میں پہنچا تو حمیدہ کی ماں کی آواز سنائی دی جو اپنی چھت پر سے حمیدہ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

"بیٹی! شام ہو رہی ہے۔ اب گھر لوٹ آؤ۔"

میں یہ سن کر ڈیوڑھی میں ہی دبک گیا۔ حمیدہ آئی تو میں نے بازو پکڑ لیا۔ وہ گھبرا کے بولی:

"خدا کے لیے چھوڑ دو۔ کوئی آ جائے گا۔"

"کوئی نہیں آئے گا...... کب ملو گی؟"

"چھوڑ دو۔ میں ملوں گی۔"

''آج رات شیر علی والوں کے کھنڈر میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

میں نے بچپن میں میاں جی سے سن رکھا تھا کہ شیر علی کو مرے ہوئے کوئی چالیس پچاس سال گزر چکے ہیں۔ اس کے بیٹے اس کی زندگی ہی میں سرکاری ملازمتوں پر بڑے بڑے عہدے پا کر شہروں میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ مگر شیر علی نے اپنا آبائی گھر چھوڑ کر کہیں باہر جانے سے انکار کر دیا تھا اور آخری دم تک وہیں رہا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، چھوٹی اینٹ کے بنے ہوئے اس گھر کی ڈیوڑھی کے دیمک خوردہ کواڑوں پر ایک زنگ آلود موٹا سا تالا دیکھتا آ رہا تھا۔ کمروں کی چھتیں کہیں آدھی کہیں پوری گر چکی تھیں۔ چار دیواری ڈھے چکی تھی۔ لڑکپن میں جب ایک مرتبہ میں اور میرا دوست انور گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں حوصلہ کر کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس آسیب زدہ حویلی کی سیاحت پر نکلے تو ہم قدم قدم پر تھرا اُٹھتے تھے۔ سنسنی لہر در لہر ہمارے جسموں میں دوڑ رہی تھی۔ خوف کے باوجود تجسس کا ایک جوش، ایک جذبہ ہمیں سنبھالا دیتا ہوا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لیے جاتا تھا۔ فرش پر مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر کے اوپر اور نیچے آڑھے ترچھے شہتیر پڑے تھے۔ ڈیوڑھی کا شہتیر ایک دیوار پر اٹکا فرش پر سرنگوں تھا۔

اپنے مکینوں کے انتظار میں اس حویلی کا جسم ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا جا رہا تھا۔ باہر شاید شیر علی کی روح موٹی آہنی زنجیر پر لگے زنگ آلود تالے کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی تاکہ اس کی موت کے بعد بھی کوئی اندر نہ جا سکے۔ اندر کیا تھا جس کو وہ محفوظ رکھنا چاہتی تھی؟ وہاں تو ایک طاق میں پڑا ہوا، دھول مٹی سے اٹا ہوا صرف ایک دیا تھا جس کے منہ پر ملگجی سا نشان اس بات کا ثبوت باقی رہ گیا تھا کہ وہ بھی کبھی روشنی پھیلایا کرتا تھا۔

''آؤ! یہ دیا لے چلیں۔'' میں نے کہا،

''نہیں۔ یہ اس گھر کی آخری چیز ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد شیر علی کی روح بہت ناراض ہو گی۔'' انور نے کہا۔

''اتنی اچھی اچھی چیزیں لوگ اٹھا کر لے گئے مگر شیر علی کی روح نے انہیں کچھ نہ کہا۔

اس مٹی کے دیے کے جانے پر وہ کیا ناراض ہو گی۔''

''آخری چیز جانے کا اسے بہت دکھ ہو گا کیونکہ پھر گھر بالکل خالی رہ جائے گا۔''

ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم نے ایک نئی دریافت کر لی ہو۔ کولمبس کی طرح ہم حیران تھے کہ حویلی فیروز آباد میں ہی تھی؟ ہم اپنی پیدائش سے لے کر آج تک یہیں رہتے آئے تھے اور اس سے بالکل بے خبر تھے جو ایک پورا جہان تھا۔ بالکل نیا اور قطعی مختلف۔ ہم اس قدر حیران تھے کہ ہمیں وقفوں وقفوں سے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا پڑتا تھا کہ یہ فیروز آباد ہی ہے اور ہم گاؤں سے ایک قدم بھی باہر نہیں گئے۔ یہ کھنڈر میرے پڑوس میں تھا، تعجب ہے کہ ہمیں آج تک اس کی خبر نہ لگ سکی تھی۔

رات کو ایک موٹے کھیس کی بکل مارے گھر سے انور کے پاس جا کر پڑھنے کا بہانہ کر کے میں شیر علی والوں کے کھنڈر میں حمیدہ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ ڈیڑھ پہر رات گزر گئی۔ ہر طرف مکمل خاموشی چھائی تھی۔ چاند بلندیوں پر ٹکا نیلی نیلی دھند برسا رہا تھا۔ خدا جانے آتی بھی ہے یا نہیں؟ اسے پیار بھی ہے یا نہیں؟ کبھی کبھار کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ لے تو اسے پیار کا اظہار تو نہیں کہا جا سکتا۔ دور کہیں کوئی کتا بھونک رہا تھا اور بھونکے جا رہا تھا۔ کسے بھونک رہا ہو گا؟ کچھ ضروری تو نہیں کہ وہ کسی کو ہی بھونک رہا ہو۔ بس ایسے ہی بھونک رہا ہو گا۔ مثلاً اپنی ہی دم کو۔ جیسے میرا دل پکار رہا ہے اور پکارے جا رہا ہے، حمیدہ کو۔ حمیدہ بھی تو ایک واہمہ ہی ہے جسے میرے دل نے اختراع کر لیا ہے۔ میں مایوس ہو کر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سامنے والی دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ کھنڈر کی طرف اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر چلی آ رہی تھی۔ دو لرزتے، پھڑکتے بدن لپٹ گئے۔ ہم گاہے گاہے وہاں ملنے لگے۔ لیکن اپنی محبت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھنے کے عہد پر قائم رہے۔ ایک شب میرے جسمانی تقاضوں کے سامنے اس عہد کے قائم رہنے کا کوئی امکان نہ تھا کہ حمیدہ نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر نہایت محبت، انکساری اور پیار سے کہا: ''شفیع! تم سے ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گے؟''

میرے کان کھڑے ہوئے، میرے دل میں بیٹھے ہوئے چور نے پہلو بدلا۔

''تم کوئی بات پوچھو اور میں برا مانوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میری ماں کہتی تھی کہ......''

''ہاں ہاں کہو! رک کیوں گئیں؟''

''میری ماں کہتی تھی کہ تم بھائی غلام احمد کے بیٹے ہو۔''

میں شل ہو گیا، میرا جوش، جذبہ اور انگیخت سب اس طرح سرد ہو گئے جیسے کبھی میرے بدن میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ذہن میں کہیں سے ایک بے آب و گیاہ سا میدان ابھر کے سامنے آ گیا۔ مجھے جواب دینے کا ہوش نہ رہا، مجھ میں انکار کرنے کی سکت نہ رہی۔ میں کچھ نہ بول سکا، میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ کوئی بھی کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ میں خاموش، چپ، پتھر کا بت بنا بیٹھا رہ گیا۔ وہ مجھے چومتی رہی، معافی مانگتی رہی۔ میں کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح کہہ سکوں کہ کوئی بات نہیں۔ مگر میرے لب نہ ہل سکے، وہ اپنے گھر والوں کے خوف سے آخر مجھے وہیں پہ بیٹھا چھوڑ کر چلی گئی اور میں صبح تک آدھی ٹوٹی ہوئی چھت میں بیٹھا تاروں بھرے آسمان کو تکتا رہا۔ سکول سے گھر کی طرف بھاگنا ختم ہو گیا۔

میرے دل میں حمیدہ کا پیار ایک پھانس کی طرح کھٹکتا رہتا تھا مگر اب مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ امتحان بھی ختم ہو گئے۔ انور کا باپ تبدیل ہو کر دوسرے حلقے میں پٹواری لگ گیا اور انور کو بھی فیروز آباد چھوڑ کر جانا پڑا۔ کھلتے ہوئے موسم کی ایک رات اپنی تنہائی سے تنگ آ کر میں پتہ نہیں کیوں، کس خیال اور کس جذبے کے تحت شیر علی والوں کے کھنڈر میں پہنچ گیا۔ اور اس جگہ بیٹھ گیا جہاں میں اور حمیدہ کبھی مل کے بیٹھا کرتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اب حمیدہ آ جائے تو میں کیا کروں گا۔ بھاگ جاؤں گا؟ نہیں، بیٹھا رہوں گا۔ نظریں اونچی کر کے اسے دیکھ سکو گے؟ ایک نظر تو ضرور دیکھوں گا۔ اس سے بات کرو گے؟ ہاں، اگر وہ کرے گی تو۔ میں دراصل اس سے ناراض نہیں ہوں، میں تو صرف

اپنے آپ سے ناراض ہوں، اس لیے اسے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ کاش حمیدہ میرے دل کی پکار سن لے اور آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اسے کون جا کے بتائے کہ میں اب اندھیرے میں اس کا سامنا کرنے کے قابل ہو گیا ہوں اور وہ صرف ایک مرتبہ پہلے کی طرح آ کے میرے سینے پر سر رکھ دے تو شاید دن میں بھی اس کا سامنا کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ میں اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن تھا کہ مجھے حویلی کے صحن میں دور سے ایک سایہ اپنی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک اٹھا کہ شاید جو جذبہ مجھے یہاں کھینچ لایا ہے وہی جذبہ حمیدہ کو بھی کشاں کشاں یہاں لے آیا ہے۔ لیکن وہ حمیدہ نہ تھی، اتنے لمبے لمبے ڈگ وہ کیا، کوئی عورت بھی کیسے بھر سکتی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں کھسک گیا اور اس کے بعد ایک اکھڑے ہوئے کواڑ کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟ حمیدہ سے ملنے؟ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا، یہ ناممکن ہے۔ حمیدہ نے اتنے تھوڑے عرصے میں میری محبت اپنے دل سے نوچ کر پھینک دی ہو گی۔ اس نے تو سدا میری بن کے رہنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ تو میری خاطر جان دینے کے لیے بھی تیار تھی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے یہ شخص یہاں کس غرض سے آیا ہے۔ ممکن ہے اِدھر اُدھر چوری کرنے کے خیال سے آیا ہو یا کسی عورت سے ہی ملنے آیا ہو۔

اپنے معمول کے مطابق ڈیڑھ پہر رات گئے حمیدہ آ گئی۔ وہی باتیں تھیں، صرف وہ مجھ سے نہیں ہو رہی تھیں بلکہ نذیر سے ہو رہی تھیں۔ نذیر جو کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ جس کا چھریرا بدن بہت پھرتیلا تھا۔ جو اپنے بھائی کا نہیں اپنے باپ کا ہی بیٹا تھا۔ وہ اس طرح لپٹ کر بیٹھے تھے جیسے ہم بیٹھا کرتے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے کپڑے ان کے بدنوں سے الگ ہونا شروع ہو گئے اور وہ کھسکتے کھسکتے لیٹ گئے۔ اب باتیں ختم ہو گئیں تھیں اور سسکیاں اُبھر رہی تھیں۔ سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔ حمیدہ کے بازو نذیر کی چیتے جیسی کمر کے گرد لپٹے ہوئے تھے اور میں وہاں ہر احساس سے عاری کھڑا تھا۔ میرے تو جذبات جانوروں کو جفت ہوتے دیکھ کر مشتعل ہو جایا کرتے تھے، مگر یہ کیا ہوا کہ آج کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ کسی بھی قسم کا، نہ رنج کا، نہ غصے کا، نہ شہوت کا، نہ حسد کا۔ جو وہاں کھڑا تھا وہ میں نہیں تھا، شفیع نہ تھا، پتہ نہیں کون

کھڑا تھا۔ ویسے تو وہاں وہ کواڑ بھی کھڑا تھا جس کا دوسرا ساتھی نہ جانے کب کا کہیں ملبے میں دب گیا تھا یا کوئی اکھاڑ کے لے گیا تھا اور وہ اکیلا ہی مقدور بھر اپنا فرض سر انجام دیتا رہا تھا۔ اس نے بھی کسی ردعمل کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ میں دراصل اس کواڑ کا ساتھی تھا جو دفعتاً ملبے سے نکل کر یا جہاں اسے کوئی لے گیا تھا وہاں سے بھاگ کر آ کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب بھلا کواڑوں کے بھی کوئی جذبات ہوتے ہیں؟ ان کو تو جب چاہے بند کر دو اور جب جی چاہے کھول لو۔ وہ جو ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے تھے، الگ ہو گئے۔ اپنے اپنے کپڑوں کا ہوش آیا، پہنے اور لپٹ کے بیٹھ گئے۔ نذیر نے پوچھا:

''میاں احمد دین کے گھر تمہارا بہت آنا جانا ہے۔''

''غلام احمد کی بیٹی رضیہ میری سہیلی ہے، اسے کبھی کبھی ملنے جایا کرتی ہوں، ہاں تقریباً مہینہ بھر پہلے اس کی ماں سے روز کروشیا سیکھنے جایا کرتی تھی۔ اب تو زیادہ نہیں جاتی، ہائے! میری ماں نکلنے ہی کہاں دیتی ہے۔''

''شفیع ذرا نیا نیا جوان ہوا ہے کبھی گھورتا گھارتا تو نہیں۔''

''کون شفیع؟''

''وہی شفیع، میاں احمد دین کا بیٹا اور کون......''

''اچھا وہ حرامی شفیع، ہاہاہاہا۔'' حمیدہ نے کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کو پکڑے جانے کے ڈر سے سینے میں دبا لیا: ''وہ مجھے کیا گھورے گا، وہ تو خود لڑکی ہے۔'' میری وہ رات بھی اس کھنڈر میں تارے دیکھتے کٹی۔ کتنے چمکدار، کتنے بے باک، کتنے بلند۔ صبح گھر پہنچا تو ماں نے حسبِ توقع خوب زور و شور سے کوسنا شروع کر دیا۔ میاں جی کو فالج کے حملے نے بستر سے لگا دیا تھا۔ بولتے بھی دقت سے تھے۔ میں نے ان کی ٹانگیں دبانی شروع کر دی۔ میاں جی کے مضمحل، افسردہ چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی: ''رات گھر سے باہر رہتا ہے اور اب چاپلوسیاں کرتا ہے۔''

میں سر جھکائے ٹانگیں دبائے جا رہا تھا۔ میرے ہونٹوں کے کونے تھرتھرا رہے تھے اور

نتھنے لرز رہے تھے، پھڑک رہے تھے۔

میں یہ کیا اکیلا گیلری میں کھڑا دیوانوں کی طرح خلا میں گھور رہا ہوں۔ نہیں ویسے تو وہ تصویر سامنے ہے لیکن اتنی دیر سے مجھے وہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اب ہلنا چاہیے، کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے۔ کارڈ روم میں جھانک کر دیکھوں؟ کوئی واقف نہیں؟ ابھی مقابلتاً نیا ہوں کچھ وقت گزرنے پر زیادہ لوگوں سے واقفیت ہو جائے گی تو یہ اکیلا پن نہیں رہے گا۔ سیون نو ٹرمپس ایک نے چال کی، دوسرے نے حملہ کیا ڈبل۔ مخالف نے وار روک کے جوابی حملہ کیا، ری ڈبل۔ میز پر خاموشی طاری ہو گئی، ماحول میں بجلی کی رو سی دوڑ گئی۔ ہر کوئی گھات میں پنجوں پر بیٹھا تھا کہ جونہی موقع ملے تو جھپٹ پڑے۔ کاغذی تصویریں زندہ ہو گئیں۔ وہ ایک ایسے احساس و کردار کی مالک بن گئیں جو خود تاثر قبول کرتی ہیں اور جواباً دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ بادشاہ پٹ گیا۔ اس کی مونچھیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کھیلنے والے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، سر پہ یہ ناگہانی ضرب کیسے آ پڑی۔ غلام ملکہ کو لپیٹ کے چلتا بنا۔ وہ خاموش چلی جا رہی تھی۔ غلام کی آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ چھلکی پڑ رہی تھی۔ ہم بھی تو تاش کے پتے ہیں۔ شاید آسمانوں پر چار خدا بیٹھے برج کھیل رہے ہیں۔ ہم ان کے پتے ہیں۔ ان کے ذوقِ ہنگامہ جوئی کی تسکین کے لیے تاش کے پتے مار رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ یہ ہاتھ جو کھل رہا ہے دھرتی کے کئی جگوں پر مشتمل ہو گا اور اس میں ہمارا خدا غالباً ڈمی ہے...... یہ وقت بھی انسان کے سینے پر کتنا بوجھل پتھر دھر گیا ہے کہ ہلتا ہی نہیں۔ کیا کیا حیلے بہانے کرنے پڑتے ہیں اس سے جان چھڑانے کے لیے مگر یہ کہاں جاتا ہے چھوڑ کے۔ بلائے بے درماں بنا موجود رہتا ہے۔ جہاں جھگڑے نہ ہوں وہاں خود کھڑے کر لیے جاتے ہیں کہ کسی طرح اس کی موجودگی کا احساس تو کم ہو۔ کچھ میزوں پر لوگ فلاش کھیل رہے ہیں اور جلدی جلدی سرکاری افسروں کو زیادہ سے زیادہ پیسے جتوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت حریص پلوں کی طرح دودھ پیے جا رہے ہیں اور صبح ان کے اشاروں پر دم ہلائیں گے۔ کھانا کمرہ ابھی خالی پڑا ہے، بار پر چلتا ہوں۔

کھڑا تھا۔ ویسے تو وہاں وہ کواڑ بھی کھڑا تھا جس کا دوسرا ساتھی نہ جانے کب کا کہیں ملبے میں دب گیا تھا یا کوئی اکھاڑ کے لے گیا تھا اور وہ اکیلا ہی مقدور بھر اپنا فرض سرانجام دیتا رہا تھا۔ اس نے بھی کسی ردعمل کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ میں دراصل اس کواڑ کا ساتھی تھا جو دفعتاً ملبے سے نکل کر یا جہاں اسے کوئی لے گیا تھا وہاں سے بھاگ کر آ کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب بھلا کواڑوں کے بھی کوئی جذبات ہوتے ہیں؟ اُن کو تو جب چاہے بند کر دو اور جب جی چاہے کھول لو۔ وہ جو ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے تھے، الگ ہو گئے۔ اپنے اپنے کپڑوں کا ہوش آیا، پہنے اور لیٹ کے بیٹھ گئے۔ نذیر نے پوچھا:

"میاں احمد دین کے گھر تمہارا بہت آنا جانا ہے۔"

"غلام احمد کی بیٹی رضیہ میری سہیلی ہے، اسے کبھی کبھی ملنے جایا کرتی ہوں، ہاں تقریباً مہینہ بھر پہلے اس کی ماں سے روز کروشیا سیکھنے جایا کرتی تھی۔ اب تو زیادہ نہیں جاتی، ہائے! میری ماں نکلنے ہی کہاں دیتی ہے۔"

"شفیع ذرا نیا نیا جوان ہوا ہے کبھی گھورتا گھارتا تو نہیں۔"

"کون شفیع؟"

"وہی شفیع، میاں احمد دین کا بیٹا اور کون......"

"اچھا وہ حرامی شفیع، ہاہاہاہا۔" حمیدہ نے کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کو پکڑے جانے کے ڈر سے سینے میں دبالیا: "وہ مجھے کیا گھورے گا، وہ تو خود لڑکی ہے۔" میری وہ رات بھی اس کھنڈر میں تارے دیکھتے کٹی۔ کتنے چمکدار، کتنے بے باک، کتنے بلند۔ صبح گھر پہنچا تو ماں نے حسب توقع خوب زور و شور سے کوسنا شروع کر دیا۔ میاں جی کو فالج کے حملے نے بستر سے لگا دیا تھا۔ بولتے بھی دقت سے تھے۔ میں نے ان کی ٹانگیں دبانی شروع کر دی۔ میاں جی کے مضمحل، افسردہ چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی: "رات گھر سے باہر رہتا ہے اور اب چاپلوسیاں کرتا ہے۔"

میں سر جھکائے ٹانگیں دبائے جا رہا تھا۔ میرے ہونٹوں کے کونے تھرتھرا رہے تھے اور

نتھنے لرز رہے تھے، پھڑک رہے تھے۔

میں یہ کیا اکیلا گیلری میں کھڑا دیوانوں کی طرح خلا میں گھور رہا ہوں۔ نہیں ویسے تو وہ تصویر سامنے ہے لیکن اتنی دیر سے مجھے وہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اب ہلنا چاہیے، کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے۔ کارڈ روم میں جھانک کر دیکھوں؟ کوئی واقف نہیں؟ ابھی مقابلتاً نیا ہوں کچھ وقت گزرنے پر زیادہ لوگوں سے واقفیت ہو جائے گی تو یہ اکیلا پن نہیں رہے گا۔ سیون نو ٹرمپس ایک نے چال کی، دوسرے نے حملہ کیا ڈبل۔ مخالف نے وار روک کے جوابی حملہ کیا، ری ڈبل۔ میز پر خاموشی طاری ہو گئی، ماحول میں بجلی کی رو سی دوڑ گئی۔ ہر کوئی گھات میں پنجوں پر بیٹھا تھا کہ جونہی موقع ملے تو جھپٹ پڑے۔ کاغذ کی تصویریں زندہ ہو گئیں۔ وہ ایک ایسے احساس و کردار کی مالک بن گئیں جو خود تاثر قبول کرتی ہیں اور جواباً دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ بادشاہ پٹ گیا۔ اس کی مونچھیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کھیلنے والے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، سر پہ یہ ناگہانی ضرب کیسے آ پڑی۔ غلام ملکہ کو لپیٹ کے چلتا بنا۔ وہ خاموش چلی جا رہی تھی۔ غلام کی آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ چھلکی پڑ رہی تھی۔ ہم بھی تو تاش کے پتے ہیں۔ شاید آسمانوں پر چار خدا بیٹھے برج کھیل رہے ہیں۔ ہم ان کے پتے ہیں۔ ان کے ذوقِ ہنگامہ جوئی کی تسکین کے لیے تاش کے پتے مار رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ یہ ہاتھ جو کھل رہا ہے دھرتی کے کئی جگوں پر مشتمل ہو گا اور اس میں ہمارا خدا غالباً ڈمی ہے...... یہ وقت بھی انسان کے سینے پر کتنا بوجھل پتھر دھر گیا ہے کہ ہلتا ہی نہیں۔ کیا کیا حیلے بہانے کرنے پڑتے ہیں اس سے جان چھڑانے کے لیے مگر یہ کہاں جاتا ہے چھوڑ کے۔ بلائے بے درماں بنا موجود رہتا ہے۔ جہاں جھگڑے نہ ہوں وہاں خود کھڑے کر لیے جاتے ہیں کہ کسی طرح اس کی موجودگی کا احساس تو کم ہو۔ کچھ میزوں پر لوگ فلاش کھیل رہے ہیں اور جلدی جلدی سرکاری افسروں کو زیادہ سے زیادہ پیسے جتوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت حریص پلوں کی طرح دودھ پیے جا رہے ہیں اور صبح ان کے اشاروں پر دم ہلائیں گے۔ کھانا کمرہ ابھی خالی پڑا ہے، بار پر چلتا ہوں

سٹول کھینچا، سگریٹ سلگایا: ''ایک وہسکی لاؤ، ڈبل۔'' گلاس آیا۔ ننھی سی چمکدار بالٹی برف سے بھری آئی۔ جگمگ جگمگ کرتے چھوٹے سے چمٹے سے ایک ٹکڑا، دوسرا ٹکڑا، تیسرا ٹکڑا گرایا گیا۔ گٹ گٹ کرتی بوتل کے منہ پر لگی ٹونٹی سے وہسکی گری۔ ایک جانی پہچانی مہک جسم کے ہر ریشے میں دوڑ گئی۔ پٹاخ۔ آدھا گلاس سوڈے سے بھر گیا۔ ایک تلخ، کرارا، گھلتا ہوا ذائقہ میرے ہونٹوں سے نکل کر زبان پر پھسلتا ہوا، حلق سے نیچے بہنا شروع ہو گیا۔ نظریں سامنے رکھیں اور کان دوسرے لوگوں کی جانب گھمایا پھرایا۔ شام کے پھیلتے دھندلکوں جیسے سماں میں پانچ چھ آدمی دیوار کے ساتھ لگے گدے دار سیاہ بنچوں پر بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کوئی خاص باتیں نہ تھیں۔ کچھ دوستوں کے شکوے، کچھ کاروبار کے منصوبے، کچھ سیاست کے تذکرے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا واقف نہیں، کس سے بات کی جائے۔ سیٹھ حسن بھائی کاٹن کنگ باہر بیٹھا ہے۔ شاید شراب پی رہا ہو مگر اس کے ساتھ اپنا دوستوں کا گروپ ہے۔ اس طرح دخل اندازی ناپسندیدہ ہے اور پھر وہ بات بھی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی دیوتا آسمان کی بلندیوں سے اپنی مخلوق کے لیے ہدایات جاری کر رہا ہو۔ میں اس سے چھوٹا تاجر ہوں اس لیے بھی وہ مجھے کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ ہنس مکھ، لطیفے باز، بوڑھا وکیل خواجہ لطف الرحمٰن اس وقت گردن تک برج میں دھنسا بیٹھا ہے۔ میں تو شاید اسے نظر بھی نہیں آیا ہوں گا۔ مگر میں ان لوگوں کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ کوئی بات کرنے والا جو نہیں ہے۔ کون کس سے بات کرنے والا ہے یہاں؟ میں نے آج تک کسی سے بات نہیں کی، کسی نے آج تک مجھ سے بات نہیں کی۔ کون سنتا ہے کسی کی، ہر کوئی سنانے والا ہے۔ نہ سنانے والا وہ کہہ پاتا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اور نہ سننے والا کبھی وہ سنتا ہے جو دوسرا کہہ رہا ہے۔ باتیں کرنا تو صرف ایک ہنگامہ، ایک شور پیدا کرنے کا طریقہ ہے جس سے ہم وقت کے بوجھل پتھر کو سینے سے کھسکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں نے پہلے کبھی اتنا تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ وقت کا پتھر پہلے کبھی اتنا بوجھل نہ تھا۔ دوسروں کی صحبت کی اتنی تلاش نہ ہوا کرتی تھی۔ اب جب سے یہ عجیب عجیب خواب آنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے،

تنہائی پگھلے ہوئے سیسے کی مانند قطرہ قطرہ میرے دل کے کوزے میں گرتی رہتی ہے اور اسے بوجھل تر بناتی ہے۔ آخر اس بڑھتے ہوئے بوجھ سے تھک کر وہ ٹھہر جائے گا۔ تو ٹھہر جائے، کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر یہ وقت کا پتھر تو کسی طرح ہلے۔ دفتر میں تھکا تھکا رہتا ہوں، ماتحتوں سے لڑتا ہوں۔ بیگار بھگتانے کے انداز میں کام کرتا ہوں۔ بیوپاری جو زیادہ قریب آنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، ان سے پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔ یہ سب کیسے اور کیونکر شروع ہو گیا؟ وہ لگن جو کاروبار میں مجھے ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف اڑائے لیے جاتی تھی، کہاں چلی گئی؟ میرے دن اور رات اندرونِ ملک سے آئے ہوئے کپاس بیچنے والے بیوپاریوں یا بیرونی ممالک سے آئے ہوئے کپاس خریدنے والے بیوپاریوں، دلالوں اور کمیشن ایجنٹوں کے ساتھ گزرتے تھے اور مجھے وقت کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ شاید دولت کی نئی نئی ریل پیل مجھے سب کچھ بھلائے ہوئے تھی اور اب دیکھ لیا ہے کہ دولت کے انبار چاہے کتنے بلند ہو جائیں میری زندگی کی کوتاہ قامتی کو بلندی عطا نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی دولت ایک حد کے بعد آرام، آسائش اور سکون میں قطعی کوئی اضافہ کرنے کی اہل نہیں رہ جاتی۔ مگر سیٹھ حسن بھائی تو اس طرح نہیں سوچتا۔ یقیناً مجھے ہی کچھ ہو گیا ہے۔ شاید کاروبار میں کامیابی حاصل کرنا میرے لیے اپنے ماضی سے بدلہ لینے کا ایک ذریعہ تھا۔ اب جبکہ میں اپنے ماضی کو قتل کر چکا ہوں تو مزید دلچسپی لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ میں نے دراصل اپنے رہنے کے لیے ذہن کا ایک خانہ مقرر کر لیا تھا، جو حال کا خانہ تھا۔ جو مستقبل بنانے کا خانہ تھا، جو ماضی کو نیست و نابود کرنے کا خانہ تھا اور اسے ہر طرف سے مکمل بند کر لیا تھا...... اور میرا خیال تھا باقی ذہن شیر علی کے گھر کی طرح میری بے توجہی کے باعث آہستہ آہستہ خود ہی کھنڈر بن جائے گا مگر اب وہ کھنڈر میری اس پناہ گاہ میں در آنے کو تلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ویرانی اور نحوست اس خانے پر بھی وارد کرنے کے درپے ہے۔ کہیں یہ سارا کاروبار ٹھپ ہی نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر میں تھرا اُٹھا۔ نہیں نہیں کچھ ایسی بات نہیں۔ میں کہاں تنہا ہوں۔ ایسے ہی اپنے اوپر تنہائی لادنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کلب میں اس وقت ایک ہجوم موجود ہے، جس میں سے

ایک میں بھی ہوں۔ ہم سب مل کر ایک دوسرے کی تنہائی دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وقت نے جو پتھر ہمارے سینوں پر رکھے ہوئے ہیں، انہیں ذرا ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم سب کس قدر امداد باہمی کے قائل ہیں۔ اتنے میں دو نوجوان بار پر کہنیاں رکھ کے بڑی سکندرانہ شان سے آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے منہ دوسری طرف اور کان ان کی طرف گھمایا:

''اچھا پھر؟''

''پھر میں اسے نیچ پر لے گیا۔ ڈیڑھ بجے رات تک خراب کرتی رہی، نہیں مانی سالی۔''

''ہاہاہاہا! کیا کہتی تھی؟''

''وہی ایک بات، شادی کر لو......!''

''بڑی چالاک تھی۔ حرام زادی۔''

''دیکھو تو! لوگوں کے بھی کیا کیا دماغ خراب ہوتے ہیں۔''

''یار تُو بھی الو ہی ہے۔ ایسی لڑکیوں کا بس ایک ہی علاج ہوتا ہے۔ اپنے سر کی قسم دے کر دو تین بڑے پلا دو، سب معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''ارے وہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن وہ تو کسی طرح پٹھے ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔ چلو چھوڑو اس سالی کو۔ یہ بتاؤ! دتو کے پاس کوئی نیا مال آیا ہے کہ نہیں۔''

''ہاں یار۔ رات ایک بڑی زوردار لڑکی لایا تھا۔ تازہ آئی ہے۔ لیکن اسے کچھ بات وات کرنی نہیں آتی تھی۔ پشتو مارتی تھی الٹی سیدھی۔''

''تُو نے اپنا کام ٹھیلنا تھا یا باتیں کرنی تھیں، ہاہاہاہا۔''

میں نے کان لپیٹ لیا۔ کچھ مزہ نہ آیا۔ وہی باتیں جو پہلے ہزار مرتبہ سنی ہوئی تھیں۔

''ایک ڈبل اور لاؤ۔'' تین تو پہلے پی چکا ہوں۔ اکیلے پینے میں نشہ کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ نہ پتہ چلتا ہے کہ ہوا ہے اور نہ ہی پتہ چلتا ہے کہ نہیں ہوا۔ ایک گونج سی دماغ میں جاری ہو جاتی ہے۔ وقت گزارنے کا ایک اچھا طریقہ عورت بھی ہو سکتی ہے، چاہے

کرائے ہی کی کیوں نہ ہو۔ اگر اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم اپنے بھائی کے بیٹے ہو کہ باپ کے تو کیا جواب دوں گا؟ چلو! پاگل مت بنو۔ ایسا سوال وہ کیسے پوچھ سکتی ہے؟ بس ایک مرتبہ بات ہو گئی، سو ہو گئی۔ اب کسی طرح دتو کو تلاش کرنا چاہیے۔ ان لڑکوں سے تو پوچھا نہیں جا سکتا، مگر کیا ضرورت ہے، شہر بھرا پڑا ہے دتوؤں سے۔ اپنا رستم علی بھی ایک طرح کا دتو ہی تو ہے۔ البتہ سٹاک ان ٹریڈ کم ہے اور ورائٹی نہیں ہے۔ ہاں جو کچھ مال ہے وہ کھرا ہے، ایک کونے میں بہت زور سے کسی نے نعرہ لگایا: ''خدا کی قسم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔'' ایک شخص اپنی نشست سے اٹھ کے کھڑا ڈول رہا تھا: ''لیکن میں تمہارا خادم ہوں۔'' اور جھک کر اپنے ساتھی کے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھا خوشیا یہاں کہاں پہنچ گیا؟ ہماری ڈیوڑھی کے سامنے گلی کے پار ایک چھوٹی سی دبی کوٹھری میں وہ اپنی بیوی اور بچوں سمیت رہتا تھا۔ کوٹھڑی کی بیرونی گلی والی دیوار میں ایک سوراخ تھا جس میں ایندھن ڈال کر میلے کپڑے کو صاف کرنے کے لیے وہ بھٹی گرم کرتا۔ آئے دن بھٹی گرم کرتے رہنے سے دیوار دھوئیں سے اس طرح اٹ گئی تھی جیسے کسی نے کالا پینٹ کر دیا ہو۔ خوشیا ہی کی طرح کا ایک بیمار، کمزور، دبلا پتلا، ٹیڑھی ٹانگوں والا چھوٹا سا گدھا اس کے دروازے سے ہٹ کر بندھا ہوتا۔ جوار کا سوکھا ٹانڈا کچر مچر کرتا اس کے منہ میں غائب ہوتا جاتا اور وہ اپنی میلی اداس آنکھوں سے گلی میں گھورتا رہتا۔ پاس ہی بھا خوشیا کے بچے بڑی بڑی توندیں نکالے، ننگ دھڑنگ، بہتی ناکیں اڑستے ہوئے اپنے سوکھے خشک بازوؤں کے زور سے روٹی کے ٹکڑے دانتوں سے کھینچ رہے ہوتے۔ میں نے اس گدھے کو کبھی ہنہناتے نہ سنا تھا۔ شاید وہ گدھی تھی۔ شاید وہ گدھی بھی نہیں تھی۔ فاقوں سے دراصل نہ تو وہ گدھا رہا تھا اور نہ ہی گدھی بن سکتا تھا۔ بس ہنہنانا ترک کر دیا تھا۔ بھا خوشیا سال میں ایک آدھ بار ہنہنا لیا کرتا تھا۔ یونہی ایک دن دیکھنے میں آتا ہے کہ بھا خوشیا بچوں کے جلو میں گرتا پڑتا، اول فول بکتا گلی میں اپنے گھر کی جانب چلا جا رہا ہوتا۔ سب بچے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھ رہے ہوتے اور آپس میں کھسر پھسر کرتے کہ: 'پتہ ہے! بھا خوشیا نے

شراب پی ہوئی ہے۔' بڑی احتیاط سے دھیمی آواز میں بات کی جاتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھا خوشیا کو یہ بات ناگوار گزرے اور اس کا پارہ چڑھ جائے۔ چند ثانیوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری گلی میں پھیل جاتی۔ عورتیں تماشا دیکھنے کے لیے دروازوں سے لگ کے کھڑی ہو جاتیں اور مسکراتے ہونٹوں کے کناروں پر انگلیاں رکھ رکھ کے بناوٹی تاسف اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتیں: ''ارے خوشیا! آج پھر عقل ماری گئی ہے؟ عائشہ بے چاری کی مصیبت آئے گی۔ بدبخت کیوں اپنا اس طرح برا حال کرتا ہے۔'' اب تو یہ خوشیا ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کے وہ کون سے تقاضے تھے جن کو پورا کرنے کے لیے بیچ میں لامحالہ یہ حال برا کرنے کی منزل بھی کاٹنی پڑتی تھی۔ اپنے بھلے برے کی کسے تمیز نہیں ہوتی۔ ذلت اٹھانا اور جگ ہنسائی کرانا کچھ سہل تو نہیں۔ کوئی بات تو ہو گی آخر جو خوشیا پنچایت کے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں نکال کر پھر یہی کام کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا اور بیوی کو للکارتا۔ اس کے اپنے بچے سہم کر کوٹھڑی کی دیواروں سے لگ کر کھڑے ہو جاتے کہ کہیں غلطی سے بھی اس کے راستے میں نہ آ جائیں۔

ڈانگ سی لمبی، زرد رُو، چچوڑی ہوئی چھاتیوں والی، ہمیشہ خوشامدانہ انداز میں ہنستے رہنے والی عائشہ اس دن گھونگھٹ میں زار وقطار روتی گلی میں سے بھا خوشیا کی کوٹھڑی میں سے اٹھا کر پھینکے ہوئے کپڑے اکٹھے کرتی پھر رہی ہوتی۔ ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر وہ عائشہ کو تڑاتڑ جوتوں اور مکوں سے مارنا شروع کر دیتا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے مار کھاتی رہتی جس طرح خوشیا کا گدھا اس سے مار کھایا کرتا۔ گدھا اس وقت پاس بندھا نہایت بے نیازی سے کچھ مچر اپنا ٹانڈا کھاتا یہ سوچتا ہوا محسوس ہوتا کہ آج باری عائشہ کی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بیوی کو چھڑانے کی کوشش کرتا تو گالیاں کھاتا، چاہے وہ بعد میں مار مار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دے۔ مگر اس وقت بھا خوشیا گالیاں دینے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح گلی میں اودھم مچاتا اور دندناتا پھرتا تاوقتیکہ چند نوجوان مل کر اسے پکڑ دھکڑ کر کسی کمرے میں بند کر دیتے اور دوسرے دن وہی خوشیا ایک ایک سے معافی مانگتا اور

پاؤں کو ہاتھ لگاتا پھرتا۔ میرا خیال ہے اس گدھے کو بھی حق پہنچتا تھا کہ کبھی زندگی میں چاہے ایک مرتبہ ہی سہی، شراب پی کر خوشیا سمیت سب پر دولتیاں جھاڑتا۔

''ہیلو!'' بالکل میرے کان کے پاس ہوئی۔

مسٹرائے۔ بی شیخ کے راکھ بھرے بدرنگ کوئلوں جیسے چہرے میں سفید دانت ٹھونکے ہوئے تھے۔

''ہیلو!'' میری زبان موٹی ہو چکی تھی اور آسانی سے الفاظ ادا کرنے کی قدرت کھو چکی تھی۔

''ظفر صاحب! آپ اکیلے بیٹھے ہیں۔ چلیے ہمارے ساتھ بیٹھیے، ریحانہ بھی ہے۔''

''چلیے۔''

''ہمارا ارادہ آج گھر پر ایک خاموش شام گزارنے کا تھا۔ دس بجنے تک خوش قسمتی سے ریحانہ خود ہی بول اٹھی کہ چلو کلب چلتے ہیں۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔ ممکن ہے ظفر صاحب بھی ہوں۔''

☆☆☆

دور بہت دور ایک جگہ دکھائی دے رہی ہے جیسے میلوں لمبی سرنگ کے دوسرے سرے
پر روشنی کا ایک موہوم سا دھبہ۔ میں اسے کہاں سے دیکھ رہا ہوں اور کس زاویے سے دیکھ رہا
ہوں؟ اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کوئی گھر، کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی جانور بھی تو
نہیں وہاں۔ کیا وہ کوئی صحرا ہے جہاں وہ جگہ واقع ہے؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کے
لامعنی تسلسل کو توڑنے کے لیے صحرا میں اور کچھ نہیں تو ٹیلے اور ان کی اونچ نیچ ہی ہوتی ہے۔ تو
پھر یہ کیا ہے؟ صاف چٹیل میدان ہے۔ شاید ایسا ہی ہو یا نہ بھی ہو۔ کیونکہ ہر جانب ہر سمت
سے سیاہی میں رنگا ہوا سرخ رنگ انڈا چلا آ رہا ہے۔ کچھ ٹھیک سے سجھائی نہیں دیتا۔ اس جگہ
پر کوئی خاص روشنی نہیں، بس ایک گنبد سا وہاں ٹھہرا ہے جو جگنو کی طرح وقفے وقفے سے ٹمٹماتا
ہے۔ اس کی نیلاہٹ اور سبزی مائل مدھم سی روشنی اشاروں سے بلاتی ہوئی معلوم دیتی ہے۔
دفعتاً چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی مائل سرخیوں سے سایوں کی طرح کی ایک مخلوق اس کی
طرف لپکتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ نہ تو ان کے بڑھتے پاؤں کی کوئی چاپ ہے اور نہ ہی ان
کے ہانپتے ہوئے کھلے مونہوں سے کوئی آواز نکل رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں پر مشتمل اس
ہجوم کے اگر محض سانسوں کی آواز ابھر سکتی ہوتی تو ایک تیز قیامت خیز آندھی کا شور اٹھ کھڑا
ہوتا، مگر وہاں وہی موت کی خاموشی برقرار ہے۔ اژدھام اپنی دھن کا پکا، ایک سیلِ بے امان
کی طرح دیوانہ وار آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ گنبد اپنی جگہ پر مستحکم، روشنی کے نرم نرم، مدھم مدھم
اور مدھر اشاروں سے برابر بلائے جا رہا ہے۔ لاکھوں کروڑوں کا مجمع ایک دوسرے کو

لتاڑتا، روندتا، پاؤں تلے مسلتا چلا جا رہا ہے۔ جو گر گئے وہ ہمیشہ کے لیے گر گئے اور جو باقی
ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر میں لگا ہے۔ میں بھی اپنے جسم
کے ایک ایک ریشے کو اس کی آخری انتہا تک آزماتا ہوا اِس سیلاب میں ایک لہر کی طرح اپنا
راستہ بناتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ ایک عالم نفسا نفسی بپا ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ سر اپنا اپنا ہے
مگر سودا صرف ایک ہے کہ کسی طرح گنبد تک پہنچنا ہو جائے۔ چند ثانیوں میں لاکھوں اپنے
دل میں منزل کی حسرت لیے ان سرخ اندھیروں میں دفن ہو گئے۔ میں اب سب سے آگے
ہوں اور اپنے مردہ ساتھیوں کی لاشوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہوں۔ گنبد ٹمٹمائے جائے
رہا ہے۔ اپنی سبزی مائل نیلاہٹ کو اس رفتار سے وقفوں سے بکھیرتا ہوا، نرم، مدھم، مدھر
اشاروں سے بلائے جا رہا ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میرے پیچھے اب ہجوم گھٹ کے کتنا رہ گیا
ہے؟ کون ہیں جو بالکل میری ایڑیوں کے ساتھ لگے ہوئے تند رفتاری سے پیچھا کرتے چلے
آ رہے ہیں۔ ایک بار بھی مڑ کے دیکھا تو ہمیشہ کے لیے سرخ اندھیروں میں گم ہو کے رہ
جاؤں گا۔ کیا خبر میں کب دم توڑ کے گروں اور کوئی مجھے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے۔ گنبد
نزدیک آ گیا۔ اکھڑتا ہوا دم سنبھل سا گیا، گرتا ہوا حوصلہ بلند ہو گیا، ٹوٹتی ہوئی آس پھر سے
بندھ گئی۔ یہاں پر روشنی خوب تیز ہے۔ مجھ سے آگے کوئی نہیں۔ منزل چند قدم پر ہے،
کامیابی سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔ فوری پیچھے کون ہیں؟ اتنا تجسس بھی میرے ہاتھ آتی
ہوئی کامیابی کو ناکامی میں بدلنے دینے کے لیے کافی ہے۔ چھوڑو اس خیال کو صرف ایک بار
اور زور لگاؤ اور اپنی مراد پالو۔ میں اب گنبد کے اوپر تھا۔ خوشی اور تفاخر کی رہ رہ کے اٹھتی ہوئی
لہریں میری روح اور جسم کو اندر باہر، اوپر نیچے، ہر طرف سے گدگدا رہی تھیں۔ گنبد چمکا۔ ایک
رنگ، ایک ساخت، ایک سانچے کے بنے ہوئے لاکھوں کروڑوں ہاتھ ایک بار حسرت و
یاس کے اظہار کے طور پر اوپر اٹھے اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنے ایک رنگ، ایک ساخت،
ایک سانچے کے بنے ہوئے بے چہرہ مالکوں سمیت ان خونیں دھندلکوں میں غرق ہو گئے۔
کیا میں بھی انہی کی طرح کا ایک ہوں؟ اب یہ کون بتا سکتا ہے، ان میں سے تو کوئی باقی نہیں

بجا۔ گنبد پھر نہیں چمکا...... بہت دیر ہوگئی، اسے اب تک اپنے معمول کے مطابق پھر سے چمکنا چاہیے تھا۔ کیا اس نے ٹمٹمانا بند کر دیا؟ کیا یہ بجھ گیا؟ کیا یہ صرف مجھے پھانسنے کے لیے اپنی سبزی مائل نیلی روشنی کے نرم، مدھر، مدھم اِشارے پھینک رہا تھا؟ ہر طرف اتھاہ تاریکیاں اور گھور اندھیرے چھائے ہیں۔ کیا میں نے اپنے لاکھوں کروڑوں ساتھیوں کو اس لیے خونیں دھندلکوں کے حوالے کر دیا کہ سیاہیوں کے اس بھنور میں ہمیشہ کے لیے الجھ کر رہ جاؤں؟ میں کہیں دھنستا جا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ یہ گنبد مجھے نگلے جا رہا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، میری سانس بند ہو رہی ہیں۔ میں تیزی سے گرتا جا رہا ہوں، کہیں نیچے اتھاہ گہرائیوں میں، تاریک وادیوں میں۔ گنبد کی گہرائیو! مجھے چھوڑ دو۔ گہرے اندھیرو! مجھے بخش دو۔ میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ پہلے کی نسبت بہت زیادہ تیزی سے اور اندھیروں کی بڑھتی ہوئی گونج میں میری آہ وزاری اور چیخ و پکار دب کے، ختم ہو کے رہ گئی تھی...... اور اندھیروں کی گونج شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ کارخانۂ قدرت کے بڑے بڑے پہیے عمل میں آچکے تھے۔ گررررررررررر گرررررررر کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ گرررررررر گررررررررر

ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہی جانے پہچانے پسینے سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک بہہ رہے تھے۔ پھر وہی ہانپنا، وہی کانپنا۔ لرزتے ہاتھوں میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ دل ایک گوشے میں اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ نہ وہ گنبد ہے نہ وہ اندھیرے ہیں۔ نہ وہ گہرائیاں ہیں اور نہ ہی میں گر رہا ہوں۔ بتی جلائی۔ کمرے میں کوٹ، پتلون، نکٹائی، قمیص لاشوں کی طرح بے سدھ، الٹے سیدھے بکھرے پڑے تھے۔ سلیپنگ سوٹ سلیقہ سے تہہ کیا کرسی کی پشت پر پڑا مزے سے جھول رہا تھا۔ الف ننگے بدن پر صرف پاؤں پر موزے چڑھے ہوئے تھے۔ شاید شدید نشے کی وجہ سے انہیں اتارنے کی اور سونے کا لباس پہننے کی فرصت نہ مل سکی ہو گی۔ خواب مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں جو یہ ہر رات آکر مجھے دکھ اور خوف کی بھیانک جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ پھر میں دن بھر اِن کی اذیت ناک دہشت سے لرزتا رہتا ہوں۔ جب ان کا خیال آجاتا ہے تو پھر میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی تاثر قبول نہیں کر سکتا، بس اپنی

گونج لوٹ لوٹ کر میرے دماغ میں گونجتی رہتی ہے۔ تاوقتیکہ پھر شراب نہیں پیتا۔ اگر یہی گونج مستقل ہوگئی تو کیا ہوگا۔ سب کیا دھرا خاک ہو جائے گا۔ لاکھوں کا کاروبار، جو اِتنے جتنوں سے اس منزل تک پہنچایا ہے، اجڑ کے رہ جائے گا...... اور پھر اسی طرح کوڑی کوڑی کو ترسا کروں گا جس طرح فیروز آباد سے نکلتے وقت ترسا کرتا تھا۔ نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے سر کو اور زیادہ زور سے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ یہ خواب مجھ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ دراصل میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو کہہ نہیں پا رہا۔

میرے اندر گہرائیاں ہیں۔ خالی، قطعی خالی، سائیں سائیں کرتی ہوئی گہرائیاں، جن میں ہر رات شراب پی کے میں لڑھک جاتا ہوں۔ اور پھر گرتا چلا جاتا ہوں، حدلا انتہا تک۔ میں ان خلاؤں کو شراب سے پُر کرنا چاہتا ہوں، یہ شراب سے پر نہیں ہو سکتے۔ بہت گہرے ہیں۔ شراب کی استطاعت سے بہت زیادہ گہرے ہیں۔ لیکن اگر شراب نہ پیوں تو پھر کیا کروں؟ سوؤں کیسے؟ رات رات بھر چھت کو تکتے ہوئے خیالات کے تانے بانے کہاں تک بنتا جاؤں؟ جن میں آخر کار جال میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح میں خود ہی الجھ کے رہ جاتا ہوں اور وہی سانس گھٹنے کی تکلیف جو خواب میں ہوتی ہے، وہ جاگتے میں وارد ہو جاتی ہے۔ میری چھاتی کے بوجھ! میری زندگی کے بھاری پتھر! یہ جو ہر رات تم میرا گلا گھوٹنے آجاتے ہو، ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کبھی میرے ذہن سے پھسل کر میری زبان پر آجاؤ۔

کہنا محض وہی نہیں ہوتا جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر زبان پر آجائے۔ کہنا تو صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ تم اپنی ذات، اپنی شخصیت، اپنے آپ کے اظہار کے لیے الفاظ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اختیار کر لو، جس طرح کروڑ پتی بننا، کوئی کرنی والا پیر فقیر بننا، کوئی نامی گرامی مجرم بننا وغیرہ وغیرہ۔ لوگ کوئی ایک ذریعہ کیسے اور کیونکر چن لیتے ہیں؟ بس چن لیتے ہیں۔ شراب پینا، اور اتنی پینا کہ پھر بہکنے کے سوا چارہ نہ رہے۔ یہ بھی تو ایک ذریعہ ہے اظہار کا جو میرے حصے آیا ہے۔ جیکی آج روشنی ہونے پر ایک مرتبہ جاگا، نیند سے بھری ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے ایک نظر مجھے دیکھا (قطعی ننگا ہوں، اس لیے شاید مجھے پہچان

نہیں سکا) پھر فوراً پنجوں پر تھوتھنی رکھ کے سو گیا۔ اسے کیا خبر کہ جب یہ فرش پر پڑا اطمینان
سے سو رہا تھا، تو چند فٹ پر اس کا مالک کن بھیانک اور جان لیوا حالات سے گزر رہا تھا۔ یہ
اگر ساتھ ہوتا تو اس کی ہلتی ہوئی دم اور محبت بھری نظریں میرے عذاب میں کمی تو نہ
کر سکتیں مگر جھیلنے میں قدرے آسانی پیدا کر دیتیں۔ جیکی خواب میں دھیرے دھیرے
بھونکنے لگا۔ تُو بھی اندھیروں میں پھنس کر خواب میں گر رہا ہے۔ مجھے تو عذاب سے نجات
دلانے والا کوئی نہ تھا۔ میں تمہیں جگائے دیتا ہوں۔ عذاب سے چھٹکارا دلانے کے لیے
کتے بھونکتے تو اس وقت ہیں جب کسی کو ڈرانا یا خوفزدہ کرنا چاہتے ہوں یا پھر اعلانِ فتح کے
طور پر بھونکتے ہیں۔ جیکی کے پاؤں ہل رہے تھے اب پیچھا کر رہا ہوگا۔ بلاوجہ کسی کی جان کو
آ رہا ہوگا۔ اٹھا دینا ہی ٹھیک ہے۔ میں نے زور سے آواز دی: ''جیکی جیکی!'' وہ گھبرایا ہوا سا
اٹھ کے بیٹھ گیا۔ کان کھڑے تھے، چوکس اور مستعد۔ گردن گھما کے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور
پھر ششدر آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر روز آدھی
رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتے ہو اور آج تو قطعی ننگے بھی ہو۔ مجھے اپنا جسم نامانوس اور اجنبی سا
محسوس ہوا۔ جیسے یہ میرا اپنا جسم نہ ہو، میں نے اٹھ کے شب خوابی کا لباس پہن کے جیکی کا
عذر دور کیا۔ سر درد کی دو گولیاں الکا سیلزر سے نگل کے بستر پر لیٹ گیا۔ روشنی اندھیروں کو
ڈرانے کے لیے جلتی رہنے دی۔ دراصل میرے اندر اندھیرے ہیں اور انہیں اجالے کی
ضرورت ہے۔ محض اتنے اجالے سے بات بن جائے گی جتنا اجالا ایک بھرپور اندھیری
رات میں ایک جگنو کر سکتا ہے۔ لیکن وہ جگنو کہاں سے لایا جائے؟ مگر جگنو تو ابھی موجود تھا جو
رہ رہ کے ٹمٹما رہا تھا اور اندھیری رات میں اجالوں کے پیغام سے تمہیں اپنے پاس بلا رہا
تھا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی۔ میرے بدن کا ایک ایک بال اپنی جڑوں میں کھڑا ہو گیا۔
سوتے میں تو ذہن میرے قابو سے باہر ہوتا ہے لیکن اب جاگتے میں گزرے ہوئے عذاب
کو پھر سے اپنے اوپر وارد کرنے سے کیا حاصل۔ میں اب اس خواب کے بارے میں کچھ
نہیں سوچنا چاہتا۔ نادانستہ اٹھ کے باہر چلا آیا اور برآمدے سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر

چھت پر پہنچ گیا۔ چاند کی ایک بڑی سی پھانک گہرے نیلے آسمان کے درمیان ٹکی خوب زور و
شور سے چاندنی کی دھند برسا رہی تھی۔ دور تک چھوٹی بڑی عمارتیں خاموشی میں ڈوبی پھیلتی
ہوئی چلی گئیں۔ کسی اکا دکا عمارت کا کوئی روشندان یا کھڑکی اپنی آنکھ پھاڑے دیکھنے کی
کوشش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کی نمی میں ڈوبی ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی
میرے بال اڑاتی، کپڑے پھڑ پھڑاتی چلی آ رہی تھی۔ شہر کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، جیسے کوئی
روایت کا دیو وہاں پھر گیا ہو، رات سے بڑا دیو اور کون ہو سکتا ہے جو جسموں کو سلا کے ذہنوں
میں آگ سلگا دیتا ہے۔ اس وقت صرف تیز ہوا اور نکھری ہوئی چاندنی زندہ ہیں، سب سے
طاقتور ہیں اور سب پر حاوی ہیں، ان سے کون ٹکر لے سکتا ہے۔ ان کے سامنے تو صرف سیس
نوایا جا سکتا ہے یا ان کے جلو میں چلا جا سکتا ہے۔ میرے کمرے کا روشندان بھی تو دیکھنے
والوں کو اسی طرح روشن نظر آ رہا ہوگا جیسے مجھے اِدھر اُدھر ایک، دو روشندان چمکتے ہوئے نظر
آ رہے ہیں۔ مجھے ایک انجانے احساس کی جلن سونے نہیں دیتی۔ ان جلتے روشندانوں کے
مکینوں کو کیا تکلیف ہو گی؟ کوئی سی تکلیف بھی انہیں ہو لیکن ان میں اور مجھ میں ایک ربطِ
باہمی ہے، ایک قدر مشترک ہے۔ صبح ان سے ملوں گا، صبح ان سے پوچھوں گا۔ شاید ان کی
کہانیوں سے مجھے اپنے بارے میں کوئی سراغ مل سکے۔ باقی سب لوگ کتنے اطمینان اور
چین سے سو رہے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ ان لوگوں پر جن کو سوتے میں اندھیرے کے بھیڑیے
اٹھا کر گہرائیوں میں لے جاتے ہیں، اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ کیا بیوقوفوں جیسی
باتیں کرتے ہو۔ چند منٹ پہلے تمہارا روشندان بھی تو بجھا ہوا تھا۔ دیکھنے والا تو یہی سمجھتا کہ
اس اندھے روشن دان کے کمرے میں تم چین اور اطمینان سے سو رہے ہو، چاہے اس وقت تم
پاتال کی گہرائی میں پہنچ چکے ہو۔ کیا خبر اس ایک رات میں کتنے روشندان جل جل کے بجھے
ہیں اور کتنے بجھ بجھ کے جلے ہیں۔ اے شہر! ایک بار انگڑائی لے کر اٹھ اور اپنے آپ کو اپنے
ہی ہنگاموں میں لپیٹ لے، تجھے مردہ دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ موت اور خاموشی
چاہے کتنی سچی ہیں، ان کے سچ کو ایک بار اپنے جھوٹ سے جھٹلا دے۔ تیرے شور و غوغا اور

ہاؤ ہو کے سامنے دلوں میں پھیلے ہوئے غم سمٹ کر ایک نقطے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں ہر وقت ایک ہلکی سی ٹیس، ایک ہلکی سی جلن ابھرتی تو رہتی ہے لیکن جب ذرا زیادہ سر اٹھائے تو اس کو دبایا بھی جا سکتا ہے۔ ہم ہر وقت ایک دوسرے کے گوشت اور ہڈیوں کو نوچنے کی فکر میں رہیں تو اچھا ہے نہیں تو ہم اپنے آپ کو کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تنہائی میں یوں سمجھئے کہ ہماری اپنی ذات ہمارے لیے ایک دیوانے کتے کی صحبت کے مترادف ہوتی ہے جو ہر لحہ اچھل اچھل کر ہم پر لپکتا ہے اور ہم بچاؤ کی ترکیبیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہم جب تک دیوانے کتے کے احساس کو بھلائے رکھیں اچھا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کے ہوتے ہوئے کبھی اپنے ساتھ ہونے کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ زندہ رہنے کے باوجود اپنے آپ سے خوف کھاتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ سے چھپے رہنا چاہیے۔ زندگی تو زندہ ہونے کے احساس کو ختم کرنے کی ایک مستقل کوشش ہے۔ انسانوں کی بستی کو ایک سچ زیب دیتا ہے کہ ان کی زندگی کا انحصار جھوٹ پر ہے۔

دیکھتے دیکھتے بہت سے روشن دان چمک اٹھے۔ شاید صبح قریب ہے۔ میں جس طرح تھکے پاؤں سے اوپر آیا تھا اسی طرح نیچے پہنچ گیا۔ جیکی نے پوری زبان باہر نکال کے اس کا لام سا بناتے ہوئے جمائی لی اور ڈنٹر نکالنے کے انداز میں انگڑائی لی اور دم ہلاتے ہوئے میرا منہ دیکھنے لگا۔ معاً میرے ہونٹوں پر کہیں سے ایک سوال آ گیا۔ 'جیکی تو بھی اپنے بڑے بھائی کا بیٹا تو نہیں؟' وہ احمقانہ سی نظریں میرے چہرے پر گاڑے کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ شاید اسے جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ یا اس خطرناک سوال کا وہ جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بستر پر بیٹھے ہوئے جیکی کو دونوں ٹانگوں سے لپٹا لیا، جیسے میاں جی مجھے لپٹایا کرتے تھے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بڑے تشکر سے پیار کرا رہا تھا۔ جب تیری ماں حاملہ ہوئی تھی تو تب باپ کی صلب میں سے تیرے سوا اور کتنے سپرم اپنی اظہار کے لیے وجود کا جامہ پہننے کی کوشش میں دوڑے تھے، لاکھوں کروڑوں ہوں گے۔ وہ سب تو مارے گئے اور میری طرح تُو وہ اکیلا خوش قسمت ہے جس نے منزل کو پالیا۔ اور آج سفید فر کا سوٹ پہنے میرے

پاؤں سے چمٹا کھڑا ہے۔ اتنی جانکاہ محنت اور خود غرضانہ رویے کا محض اتنا سا نتیجہ نکالنا تھا۔ الو کا پٹھا۔ میں نے اس کے پیچھے ایک چپت لگائی وہ ہلکی سی چوں کر کے الگ ہو گیا۔ تم بھی وجود کا لباس نہ پہنتے تو کیا فرق پڑ جاتا؟ لیکن پھر یہ چوں کون کرتا۔ ربڑ کی اس گڑیا کے سُر میں کہ جسے جب بھی الٹے سے سیدھا یا سیدھے سے الٹا کیا جاتا ہے تو ایک لمبی چیخ سے رویا کرتی ہے۔ اب بتانے والا چاہتا تو اسے ہنسنے والی گڑیا بھی بنا سکتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی سچائی پسند ہوگا۔

مجھے یاد آ گیا (خدا معلوم کیوں) کہ میں چھوٹا سا تھا اور سکول نیا نیا جانا شروع کیا تھا کہ ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ دھندلکا پھیلا ہے اور ہمارے صحن میں سیڑھیوں کے نزدیک گوشت کے دو بڑے بڑے سے ڈھیر لگے ہیں۔ جیسے بقر عید پر قربانی کا گوشت تقسیم کرنے کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ اور میں ان ڈھیروں میں تنہا کھڑا حیران ہوں کہ یہ اتنا سارا گوشت کہاں سے آیا ہے اور یہاں کیوں رکھا ہے، جبکہ آج عید بھی نہیں ہے۔ گوشت کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ مجھ پر حیرانی کے علاوہ نہ جانے کیوں خوف و ہراس طاری ہونے لگتا ہے مگر میں اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑا رہتا ہوں اور مجھے بھاگ جانے کا خیال بھی نہیں سوجھتا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میاں جی کرتے کے بازو چڑھائے دہرے ہوئے کھڑے گوشت اٹھا اٹھا کے ایک پرات میں ڈال رہے ہیں اور پھر وہ پرات اٹھا کے میری سوتیلی ماں کو دے دیتے ہیں اور وہ ڈیوڑھی کی جانب چل پڑتی ہے۔ جیسے گوشت تقسیم کرنے کے لیے جا رہی ہو۔ ہم تینوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا۔ میں بت بنا کھڑا رہتا ہوں اور وہ مشینی انسانوں کی طرح چل پھر رہے ہوتے ہیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوتا ہے جیسے مجھے بہت دیر سے معلوم تھا کہ میری ماں مر گئی ہے اور یہ اس کا گوشت ہے جو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ عجیب مخمصے میں گرفتار ہوں کہ اگر وہ مر گئی ہے تو آخر اس کا گوشت کیوں کاٹا گیا اور اب کیوں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ یکا یک غم کا ایک ریلا میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور مجھے اپنی ماں کی موت شدید افسوس ہونے لگتا ہے اور اپنے تنہا اور بے سہارا

رہ جانے کا مبہم سا احساس ہونے لگتا ہے کہ تڑک سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ کوٹھے پر چاروں طرف خوب نکھری ہوئی چاندنی پھیلی ہے، میں فوراً اپنی ماں کی چارپائی کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ مچھروں سے بچنے کے لیے چہرے پر دوپٹہ لیے سو رہی ہے اور خرخر کی ہلکی ہلکی آواز آرہی ہے۔ میں جا کے ماں کے پاس کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ آواز دینے لگا۔

’ماں! ماں!‘ اسے جگانے کا مقصد اس کی پناہ لینے سے زیادہ یہ یقین کرنا تھا کہ وہ واقعی زندہ ہے۔ وہ چونک کے اٹھی: ”کیا بات ہے؟“

”ڈر لگ رہا ہے۔“

”جانے دن بھر کیا کرتا رہتا ہے جو رات کو ڈر ڈر کے اٹھتا ہے۔“ میاں جی نے آواز دی: ”شفیع بیٹا! ادھر آ کے بتا مجھے، کیا بات ہے۔“

ماں نے کہا: ”جا جا! اپنے میاں جی کے ساتھ سو جا۔“

میں میاں جی پاس چلا گیا، انہوں نے پوچھا۔ ’ہاں! اب بتا کیا بات ہے؟ ڈر لگتا ہے؟ ہٹ نالائق۔ جوان ہو کر ڈرتا ہے۔ کیوں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کیا؟‘

خواب تھا ہی ایسا کہ کسی کو بھی کیوں کر بتایا جا سکتا تھا۔ اس خواب کے آنے پر میں اپنے دل میں بہت کچھ ندامت اور کچھ جرم کا احساس محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ خواب ہی تھا اور خواب ایسا راز تھا کہ جسے اگر کوئی نہ بتانا چاہے تو دوسرا آدمی کسی بھی وسیلے سے اس کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ میں چپ رہا۔ انہوں نے بازو سے پکڑ مجھے ساتھ لٹا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے:

”خواب خیالات کا پرتو ہوتے ہیں۔ سونے سے پہلے اچھی اچھی باتیں سوچا کر تو خواب اچھے آیا کریں گے اور ہر رات سونے سے پہلے تین مرتبہ کلمہ شریف پڑھ لیا کر، سمجھا؟ اس کی برکت سے سوتے میں آدمی ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔“ میں نے جلدی جلدی بلند آواز میں تین مرتبہ کلمہ شریف پڑھ لیا۔ جیسے جان بچانے کی کوئی ترکیب ہاتھ لگ گئی ہو اور سو گیا۔ اب سوچا کرتا ہوں کہ میاں جی رات دن قرآن پاک پڑھا کرتے

تھے، وہ بے چارے اس بلا سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جسے میری ماں کہتے ہیں لیکن یہ تو صرف اچھے خواب دیکھنے کی ترکیب ہے اور انہیں شاید خواب اچھے اچھے ہی آتے ہوں گے۔

میں نے کل شام کوئی بری باتیں تو نہیں سوچیں تھیں۔ سوتے وقت کا تو کچھ ہوش نہیں کہ کچھ سوچ بھی رہا تھا کہ نہیں۔ البتہ کلب میں آخر تک جن کا ساتھ رہا وہ ریحانہ اور شیخ صاحب تھے۔ میں جب بار سے نکل کر ریحانہ اور شیخ صاحب کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوا تو اس بڑے نیم روشن کمرے کی پوری لمبائی کے آخر میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفے پر بازو میں پڑے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ریحانہ بظاہر بڑے انہماک سے رسالہ پڑھتی قطعی اجنبی اور کہیں بہت دور بیٹھی ہوئی معلوم دی، جسے میں گویا کسی دوربین کی مدد سے دیکھ رہا تھا، اس لیے قدرے قریب نظر آرہی تھی۔ میں نشہ سنبھالنے کی کوشش میں قالین بچھے فرش پر احتیاط سے چل رہا تھا۔ جیسے پھسلن میں مرغ چل رہا ہو کہ مرغیوں پر اکڑ بھی قائم رہے اور پھسلے بھی نہیں۔ کمرے میں صرف ایک اور میز پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ ادھیڑ عمر سید شمشاد علی شاہ (جو کپاس کی برآمد کا کام کرتے ہیں اور اس طرح تجارت میں میرے رقیب ہیں) اور ان کی بیوی جو بھاری میک اپ اور رنگین ریشمی لباس کے زور پر اپنی منہ موڑ کے جاتی ہوئی جوانی کو گھیر گھار کے ہزار وسیلوں سے واپس لانے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ مگر کہاں وہ غمزے جنہیں دیکھ کر لوگ پہلے دل مسوس کے رہ جاتے ہوں گے اور کہاں یہ شتر غمزے جنہیں دیکھ لوگ زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بیگم شمشاد علی! وقت سے بھلا کون جیتا ہے۔ آپ کھیت چگ کے گئی ہوئی چڑیوں سے ایک ایک دانہ واپس کیسے اگلوا سکتی ہیں۔ ان مرجھائی چھاتیوں کو اوپر کہاں تک اٹھا سکتی ہیں۔ ہڈیوں سے الگ ہوتے ہوئے گوشت کو کولہوں پر کیسے مٹکایا جا سکتا ہے۔ ہار تو آپ کے بدن کے ریشے ریشے پر لکھ دی گئی ہے۔ اگر اسے آپ تسلیم کر لیں تو تھیٹر کا مسخرہ نظر آنے کی بجائے ایک معزز خاتون نظر آئیں۔ تیسرا شخص چہرے مہرے اور لباس سے دار الخلافہ سے آیا ہوا کوئی با اختیار سرکاری عہدے دار نظر آتا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی اسے کلب کے ایک خاموش کونے میں بٹھا کر نہایت خلوص اور

محبت سے فٹافٹ اس کے اندر شراب انڈیل رہے تھے جیسے ہماری نوکرانی فضلاں سب کی آنکھ بچا کر اپنی بہتی ناک والے غلیظ بیٹے گامے کو کسی کونے میں لے جا کر اس کے منہ میں زبردستی مکھن ٹھونسا کرتی تھی جو بار بار اس کے منہ اور ناک سے ابل پڑتا اور گاما غریب حیرانی، خوف اور جرم کے ملے جلے تاثرات سے بھری آنکھیں پھاڑے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھ رہا ہوتا اور ڈر رہا ہوتا کہ ابھی تھپڑ پڑے گا اور وہ دانت پیس پیس کے کہہ رہی ہوگی: 'کھالے حرامزادے، کھالے۔' یہ دونوں بھی مجھے محسوس ہوا جیسے اس افسر سے زبانِ بے زبانی میں کہہ رہے ہوں: 'پی لے حرام زادے، پی لے۔' وہ بے چارہ کچھ زیادہ نشے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک سیکنڈ میں کم از کم چار مرتبہ اپنے لال بھبھوکا چہرے پر انگلی سے چشمے کو ٹھیک کرتا جو ہر بار ٹھیک ہی ہوتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بیگم اور سید شمشاد علی کی آوازیں یک دم مدھم ہو گئیں۔ میں نے سید صاحب کو سلام کیا۔ شاید وہ گھبراہٹ میں اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ اب میرے لیے ان کی میز پر جانا لازم ہو گیا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا، بیگم کو آداب کیا۔ جواباً وہ ہاتھ کی کشتی بنا کر ماتھے تک لے گئیں۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن ان کی خاص اپنی مبالغہ آمیز ادائے معشوقانہ اور مسکراہٹِ محبوبانہ دیکھ کر میری ہنسی چھوٹنے لگی تھی جسے میں نے بڑی چابک دستی سے خوش اخلاقی کی مسکراہٹ میں تبدیل کیا اور رخصت ہو کر ریحانہ اور اس کے شوہر کی میز پر آ گیا۔ بظاہر ریحانہ ابھی تک سب سے بے خبر رسالے میں محو دکھائی دیتی تھی۔ آج اس نے میک اپ نہیں کیا تھا اور ایک نپے تلے بے نیازی کے انداز میں گویا یہ بتانے آئی تھی کہ دیکھ لو ہم نے سنورنے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن جاذبیت میں کوئی کمی آئی ہو تو بتاؤ۔ اس کی آنکھیں واقعی بڑی خوبصورت تھیں، روشن، بڑی بڑی اور سیاہ۔ جھٹ سے اس نے میز پر رسالہ پھینک کے ایک مسکراہٹ پیش کی جیسے معذرت خواہ ہو کہ یہ بدتمیزی بے خیالی میں ہو گئی ورنہ یہ مقصد ہرگز نہ تھا۔ جاؤ ہم نے بخش دیا۔ یہ ادا تمہارا حق ہے اور جتانا تمہیں زیب دیتا ہے۔

''ارے! ظفر صاحب، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ علیز کے ساتھ ہوں گے۔''

''مجھے آپ لوگوں کے بارے میں یہی شبہات تھے۔''

''ہاہاہاہاہاہا..........''

ہنسی بھی عجیب چیز ہے، یہ بھلا ہنسی کا کون سا موقع تھا۔ مگر ہم سب مل کر ہنسے۔ ہماری جگہ پر کوئی اور لوگ ہوتے تو وہ بھی ہنستے۔ ہم مشترکہ طور پر بیوقوف بننے پر ہنسے یا اپنے چھوٹے پن کو رد کرتے ہوئے ہنسے۔ علیز کی اس حرکت پر یا تو غصہ آنا چاہیے تھا یا رونا مگر ہم ہنسے اور کھل کر ہنسے۔ انسان بہت سی ایسی باتوں پر ہنستا ہے۔ یہ دراصل ہنسی نہیں خفت مٹانے کی کوشش ہوتی ہے۔ بہرکیف ایسی ہنسی کے لیے اور لفظ ایجاد ہونا چاہیے۔

اے۔ بی شیخ نے کہا: ''وہ لوگ مسٹر بل کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گئے۔ دعوت کو ایسا خفیہ اوکیون (Occasion) بنانے کی بھلا ایسی کون سی بات تھی۔''

میں نے ایک تاجر کی حیثیت سے رائے دی: ''کاروباری معاملات ہوتے ہی ایسے ہیں، ان میں راز داری نہ رکھی جائے تو سب کیا دھرا چوپٹ ہو جاتا ہے۔ اب میرے خریدار جو ہانگ کانگ، جاپان وغیرہ سے کبھی ادھر آ نکلتے ہیں تو میں نے کبھی ان سے آپ لوگوں کو ملایا ہے؟''

''ارے نہیں! ظفر صاحب وہ بات الگ ہے۔ علیز کو اتنی شرم تو کرنی چاہیے کہ انہوں نے ہماری موجودگی بلکہ آپ کی دعوت کھانے میں بل کو انوائیٹ کیا۔ اب جھوٹے منہ ہم سب کو بھی کہہ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ہم نے ایسی بور پارٹی میں کون سا چلا ہی جانا تھا۔''

''یوں نہ کہو ریحانہ بی۔ چلیے تو ہم نے خیر جانا تھا۔'' میں نے لقمہ دیا۔

ریحانہ باقاعدہ رنج میں آ گئی: ''تو کونسی قیامت آ جاتی۔ سناتے رہتے اسے اپنے بزنس کے دکھڑے، ہم نے اس کے کانوں میں روئی تھوڑا ہی ٹھونس دینی تھی۔''

اے۔ بی شیخ نے بات بدلی: ''کیوں ظفر صاحب! کافی چلے گی؟''

''ارے توبہ کرو! میں نے اپنا نشہ خراب کرنا ہے؟ پہلے ہی کچھ بے مزہ سا ہو رہا ہوں۔ ایک وہسکی پیوں گا۔ میں بلاتا ہوں بیرے کو......''

"نہیں نہیں! میں آرڈر دے کر آتا ہوں۔" شیخ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔
ریحانہ نے اپنا سانولہ سلونا کتابی چہرہ ہتھیلیوں پر رکھ کے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ارے ریحانہ خدا کے لیے اس طرح نہ دیکھو، میں اس طرح کی نظروں کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے کبھی کسی نے ایسی مست وحشی نظروں سے نہیں دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کے پرانے زخم، جو پتہ نہیں کب، کیسے اور کیونکر آئے تھے اور خود ہی مندمل ہو چکے تھے، اب پھر سے ہرے ہو گئے ہیں اور رسنے لگے ہیں۔ اس نے دکھ بھرے رازدانہ لہجے میں کہا: "ظفر صاحب! ایک بات پوچھوں؟"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ماتھے پر کہیں سے پسینہ آ گیا۔ نشہ جیسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ پہلے بھی کسی نے اس محبت اور لجاجت سے ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہی تھی۔ ریحانہ کو کہاں سے پتہ چل گیا کہ میں اپنے باپ کا نہیں، بھائی کا بیٹا ہوں۔ کیا ہر عورت محبت کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری سمجھتی ہے کہ اس کی نگاہوں کا مرکز کہیں اپنے بھائی کا بیٹا تو نہیں، کیا یہ کافی نہیں کہ وہ مرداُن کے جی کو لبھاتا ہے، انہیں پسند ہے۔ اس سے آخر کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی اپنے بھائی کا یا چچا کا یا ماموں کا بیٹا ہے۔ میں اٹھ کے کہنے والا تھا کہ 'بیگم ریحانہ شیخ! آپ جو کچھ سمجھتی ہیں غلط ہے۔' لیکن پھر اپنی عادت کے مطابق جوا کھیل گیا، چانس لے گیا: "پوچھیے۔"

"آخر آپ کو کیا دکھ ہے جو آپ اتنی شراب پیتے ہیں؟"
میرا رکا ہوا سانس جاری ہو گیا، بلا آ کے ٹل گئی۔ میں نے خوب زوردار قہقہہ لگایا۔
"مجھے! مجھے بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے۔ اچھا خاصا ہٹا کٹا تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔"
ہنسی اور بے نیازی سے جواب دینے کی وجہ سے وہ میرے بارے قائم کیے ہوئے اپنے مفروضے سے کسی قدر متزلزل ہو گئی۔ لیکن جلد سنبھلتے ہوئے اس نے پوچھا: "نہیں نہیں! سنیے تو ظفر صاحب۔ یوں نہیں! دیکھیں ساری دنیا شراب پیتی ہے، ہم بھی پیتے ہیں۔ لیکن آپ تو اس طرح پیتے ہیں جیسے اپنے آپ سے کوئی بدلہ چکا رہے ہوں۔ میں جب کبھی بھی

کلب آئی ہوں آپ کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور جب گئی ہوں آپ کو پیتے ہوئے چھوڑ کے گئی ہوں۔ آخر اس غیر معمولی رویے کی کوئی تو وجہ ہو گی۔"
"آپ نے کبھی اپنے شوہر نامدار سے نہیں پوچھا کہ وہ اتنی کیوں پیتے ہیں؟"
"کبھی کبھار کوئی خاص موقع ہو تو، جیسے کل رات......"
"آپ ان کی لگام نہ کھینچیں تو وہ مجھ سے بھی دو جوتے آگے رہیں۔" ایک مصنوعی سی آہ بھرتے ہوئے میں نے اپنی بات جاری رکھی: "کاش ہماری بھی کوئی لگام کھینچنے والا ہوتا۔"
"اب آپ کی لگام میں کھینچا کروں گی۔ دیکھتی ہوں آج آپ اور کیسے پیتے ہیں۔"
"ارے نہیں ریحانہ صاحبہ! یہ گھوڑا بہت منہ زور ہے۔ تمہارے بس کا نہیں۔ یونہی اس کی سواری میں کہیں گر گرا نہ جانا۔ اور پھر تم لگام کھینچنے میں ہمارے لیے وہ اپنائیت کہاں وقف کر سکتی ہو جو منہ میں دبی ہوئی لگام میں کانٹے ڈال دیا کرتی ہے۔"
"آہا۔ یہی تو میں بھی پوچھتی ہوں کہ وہ کون ہے جس کی اپنائیت کی آپ کو تلاش ہے۔ کہاں چھوڑ آئے اسے، کہاں رہ گئی وہ؟"
ریحانہ کے اس سوال میں برا منانے والی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن نہ معلوم میری آواز قدرے بلند اور بات کرنے کی رفتار قدرے تیز کیوں ہو گئی تھی اور لہجے میں رنج کا ایک سُر بھی کہیں سے آ کے شامل ہو گیا جسے میں خود بھی محسوس کر رہا تھا۔ مگر باوجود کوشش کے اسے اپنی آواز سے باہر نکالنے میں ناکام تھا:
"یہ تم عورتوں کو کیا عادت ہوتی ہے کہ جس بات میں کوسوں تک رومان کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، اس میں بھی رومان تلاش کرنا شروع کر دیتی ہو۔ یہ تم لوگوں کو کیا شوق ہوتا ہے کہ دوسروں کی زندگیوں کے صحراؤں میں چشمے تلاش کرنے نکل کھڑی ہوتی ہو۔ شاید اس غلط فہمی میں کہ مردوں کے ہر سکھ اور ہر دکھ میں تمہاری صنف اور صرف تمہاری صنف کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میری زندگی میں کسی عورت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں شراب اس لیے پیتا ہوں......

اس لیے پیتا ہوں......"

ماحول میں یکدم بہت تناؤ پیدا ہو گیا۔ ریحانہ گھبرا گئی۔

شیخ صاحب جو ابھی واپس آ کر بیٹھے تھے، بالکل حیران و ششدر تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں یہ کیا ہو گیا مگر خاموش تھے۔ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے میں نہایت مکارانہ انداز میں بولتے بولتے دفعتاً ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا: "اب بتانے کو کچھ ہو تو بتاؤں کہ کیوں پیتا ہوں۔" میرے قہقہے نے جادو کا اثر کرتے ہوئے ماحول میں سنسنی اور کھنچاؤ کو یکسر ختم کر دیا۔ میں نے اعصاب پر سے بوجھ دور کرنے کے لیے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ٹنن ٹنن کرتے ہوئے موسیقی بار گلاس سے وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا: "شیخ صاحب! اب ریحانہ کو آپ ہی بتائیے کہ آپ پینے کے اتنے رسیا کیوں ہیں؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ ریحانہ کے چہرے پر ڈالی۔ گویا اس سے پوچھ رہے ہوں کہ یہ تم نے کیا سلسلہ شروع کروا دیا۔ آخر تمہیں لوگوں سے زیادہ شراب پینے کی وجہ پوچھنے سے مطلب؟ کہنے لگے: "اب کیا بتاؤں۔ یوں سمجھئے کہ اچھی لگتی ہے وہ کیفیت۔"

"شیخ صاحب! بات یہ ہے کہ میرے اندر ایک چھوٹا سا ظفر ہے جو اصل ظفر ہے۔ اور درحقیقت وہی زندہ ہے اور زندگی کرتا ہے۔ میں کہاں زندہ ہوں، میں تو فقط اس کا مادی نمائندہ ہوں۔ اس کی پیکنگ ہوں جس کے اندر وہ بند ہے۔ میرا جسم تو اس کے لیے بالکل ایسے ہے جیسے آپ کے لیے لباس۔ وہ آقا ہے میں غلام۔ وہ پیرِ تسمہ پا ہے اور میں سند باد۔ میرے پاس اس سے جان چھڑانے کی واحد ایک ترکیب ہے کہ پی پی کے اسے سلا دوں اور آزادی کا سانس لوں۔ وہ جب سر اٹھانے لگتا ہے تو اسے شراب کی مار دے کر پھر سلا دیتا ہوں۔ آخر مجھے بھی تو زندہ رہنے کا کوئی حق ہے۔" ریحانہ نے عورتوں کے عام انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "اونہہ! بس جانے دیجیے۔ آپ محض خود محبتی میں پیتے ہیں، لیکن زیادہ پینے کے جواز میں بہانے اچھے تراشے ہوئے ہیں۔"

میں نے بیرے کو آواز دی: "ایک وہسکی۔ بڑا۔ جلدی۔"

"دیکھئے اب آپ اور نہیں پیئیں گے۔" ایک دھونس، ایک منت، ایک پکار، ریحانہ کے اس فقرے میں سبھی کچھ تھا۔ وہ اپنی دلکشی اور مجھ پر خصوصی توجہ دینے کے باوجود شکست سے دوچار تھی۔ اس کے مضبوط ترین ہتھیار ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس طرح گرتا ہوا وقار اور ٹوٹتا ہوا پندار اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ بیرا مشینی انداز میں گلاس میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے گلاس اٹھایا، آواز آئی:

"اب آپ نے ایک گھونٹ بھی لیا تو ہم احتجاجاً واک آؤٹ کر جائیں گے۔"

میں نے گلاس ہونٹوں کے پاس لا کر لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر آنکھیں بند کر کے ایک لمبا گھونٹ کھینچ گیا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے شوہر کو بلبل کی طرح ہاتھ پر بٹھائے دروازے میں سے نکلی جا رہی تھی۔ شیشے کے دروازوں میں سے مجھے وہ دوسرے اندھیرے ہال سے گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور لکڑی کے فرش پر ٹک ٹک کی ایک تال میں آنے والی آواز دھیمی ہوتی ہوئی یک دم ختم ہو گئی۔ یہ شیخ تو رستم علی کی طرح زن مرید نہ تھا، یہ بھی بھیگی بلی بنا ساتھ ہی نکل گیا۔ شاید اس نے بڑھتے ہوئے تپاک میں کچھ سونگھ لیا۔ نشے میں ڈوبی ہوئی ایک چھوٹی سی چھنکتی ہوئی طنزیہ ہنسی بکھر گئی۔ شوہریت کے تحفظ میں بیوی بھگا لے گیا۔ میں نیم روشن ہال میں وہسکی کے گلاس پر چھایا ہوا کھڑا ڈول رہا تھا۔ خالی کمرے کا تمام فرنیچر دم سادھے ٹک ٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے کسی المیہ ڈرامے کے آخری سین میں ہیرو زہر کا جام پینے کی تیاری کر رہا ہو۔ ناظرین دنیا و مافیا سے بے خبر بیٹھے اسے دیکھ رہے ہوں۔ مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میں تنہا ہوں، بے حد تنہا۔ غلاظت کے اس ڈرم کی طرح جو آدھی رات کو گلی کی نکڑ پر اپنی پوری طاقت سے منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے کہ کوئی آئے اور اس میں کوڑا ڈال کر جائے مگر کوڑا ڈالنے والے تو چاروں طرف پھیلے ہوئے گھروں میں آرام سے سو رہے ہوتے ہیں۔ وہ منہ کھولے کھڑا رہتا ہے۔ اسے لات مار کر گرا دو۔ ڈم، ڈم۔ لڑھک گیا۔ یہ تو بالکل خالی ہے۔ اس میں تو کوڑا بھی نہیں ہے۔ میں نے برا کیا، مجھے اس کا مان رکھ لینا چاہیے تھا۔ میں بے ارادہ خالی گلاس اٹھا کے بار کی طرف چل پڑا۔

کل کا خواب بہت بھیانک تھا۔شاید اس لیے گھر آنے کے تصور سے میں آج پوری شام معمول سے زیادہ خوفزدہ رہا تھا۔بار میں ہم چار پانچ دوست ایک نیم دائرے میں کھڑے تھے۔رستم علی نے اپنی منحنی انگلیوں میں گلاس جکڑا ہوا تھا۔اگرچہ وہ وقفے وقفے سے اسے ہونٹوں سے لگا بھی رہے تھے۔اور کچھ نگلتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔لیکن اس میں پڑی ہوئی وہسکی تقریباً ایک گھنٹے سے وہاں کی تہاں تھی۔میرے خیال میں اگر کوئی چڑیا اتنی دیر سے اس گلاس میں سے پی رہی ہوتی تو اب تک ان سے زیادہ پی چکی ہوتی۔وہ صحت گنوانا بھی نہیں چاہتے مگر فیشن اور کاروباری اغراض کے پیشِ نظر تعلقات میں وسعت اور رچاؤ پیدا کرنے کے لیے پینا بھی چاہتے ہیں۔اس لیے بیچ میں سے نشہ کی بجائے محض کمینگی برآمد ہوتی ہے۔میں نے اس وقت سوچا تھا (جو بعد میں درست ثابت ہوا) کہ رستم علی اکیلے کلب نہیں آسکتے، بیگم یقیناً ساتھ آئی ہوں گی۔خواتین چاہے پیتی بھی ہوں بالعموم بار پر آنے سے گریز کرتی ہیں۔اس لیے وہ لاؤنج میں خواتین کے کسی گروپ میں بیٹھی اپنے میکے والوں کے دولت مند ہونے کے بارے میں کوئی قصہ سنا رہی ہوں گی۔اس لیے خواتین میں زیادہ مقبول نہیں ہیں۔لیکن اس کی انہیں ضرورت بھی کیا ہے۔جس حلقے میں انہیں مقبول ہونا چاہیے وہاں وہ خاطر خواہ طور پر مقبول ہیں۔بل اگر ساتھ ہوتا تو بیگم رستم علی بار میں ضرور آتیں، چاہے پینے سے احتراز کرتیں۔وہ بل کہاں چلا گیا؟ خیر چھوڑو سالے کو، یہ کونسا موقع

ہے اس کے بارے میں سوچنے کا۔رشید نے شیخ مسعود سے کہا: ''جج صاحب! ان لوگوں کو وہ برما میں شکر قندی کے شہتیروں والا قصہ سنائیے۔''

مسعود نے کہا: ''ہاں! میرا ایک دوست تھا۔بہت بھولا سا......'' مجھے خیال آیا کہ آخر یہ سب لوگ ایک ایک کر کے کلب سے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جائیں گے۔دفعتاً کہیں سے بہت سا پسینہ آ گیا۔طبیعت گھبرا گئی۔مجبوراً سٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔رومال نکال کر گردن، پیشانی، چہرہ پونچھا۔پھر گلاس اس کے کاؤنٹر پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو رومال سے رگڑا۔مسعود صاحب لہک لہک کر قصہ سنا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آخری آدمی کے چلے جانے کے بعد بیرے میرا منہ تک رہے ہوں گے۔نہایت سنجیدہ نظروں سے، جیسے اس پر کوئی بہت اہم تحریر لکھی ہو، کسی انجانے رسم الخط میں۔اور یہ اس کا سراغ لگانے کی فکر میں ہوں۔تنگ آ کر ان میں سے ایک حوصلہ کر کے آگے بڑھے گا اور بتائے گا کہ ''صاحب کلب کا وقت ختم ہو گیا ہے۔آپ جتنی وہسکی چاہتے ہیں، بنا کر رکھ دیتے ہیں۔''

''تین بڑے پیگ اور سوڈا۔''

''بہت اچھا جناب۔''

ٹھک ٹھک بوتلیں، گلاس، برف کی خالی بالٹیاں الماریوں میں رکھی جائیں گی۔کٹ کٹ تالے لگیں گے اور وہ کھسر پھسر کرتے غائب ہو جائیں گے۔اس بارونق کمرے میں اس وقت میں بالکل تنہا ہوں گا لیکن پھر بھی کلب میں تو ہوں گا۔گھر سے دور، خوابوں کی دسترس سے باہر، ان کی دست برد سے محفوظ۔کہنیاں کاؤنٹر پر ہوں گی، سر ہتھیلیوں میں ہو گا۔اور اس بے پناہ نشہ کے عالم میں بھی نظریں گلاس میں کچھ ڈھونڈ رہی ہوں گی۔وہ کچھ کیا ہے، میں آج تک نہیں جان سکا۔کائنات تخلیق کرنے سے پہلے خدا صدیوں تک اسی طرح بیٹھا رہا ہو گا کہ ''کن'' کہا جائے یا نہ کہا جائے۔ذہن پتھر ہو گا اور اس کے اندر ہر ایک سوچ پتھر ہو گی جیسے پتھر کے اندر چھپا ہوا بت بھی تو سراپا پتھر ہی بنا بیٹھا ہوتا ہے تاوقتیکہ اسے کوئی باہر نکال نہ لے۔پھر اونچی ڈانگ اور چمڑے کے بڑے بڑے بے ہنگم بوٹوں والا

چوکیدار فرش پر ڈانگ بجاتا ہوا اندر آئے گا۔

''خو صاحب! جو باہر اکیلا گاڑی کھڑا ہے، وہ تمہارا ہے؟''

''ہاں!''

''خوچہ صاحب! جب تم جائے گا تو اَم کو آواز دے گا۔ اَم تالے لگائے گا۔''

یہ پہلے سیخوں پر پروئے ہوئے انسانوں پر بچوں سے چھرے چلواتا رہتا ہے پھر چوکیدار بن بیٹھتا ہے، حرامی۔ مگر ممکن ہے یہ وہ نہ ہو؟ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے کئی نام اور کئی چہرے ہیں جو یہ ضرورت اور مناسبت سے بدلتا رہتا ہے۔

ہاہاہا کا فلک شگاف طوفان بپا تھا۔ رستم علی کی دوشاخہ ہنسی بھی باقاعدگی سے زنانہ اور مردانہ سُروں میں تبدیل ہوتی ہوئی بے اختیار ابل کے قہقہوں میں شامل تھی۔ میں بھی ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔ اسی زور سے، اسی شور سے۔ کہانی میں نے نہیں سنی تھی۔ شاید کسی نے بھی نہیں سنی تھی۔ مگر سبھی ہنس رہے تھے اور والہانہ انداز میں۔ امجد نے ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے کہا......

''آج کا دن شیخ صاحب کا دن ہے۔''

رشید نے اسی طرح انگریزی میں جواب دیا: ''آج سے تمہارا کیا مطلب؟ شیخ صاحب جب بھی ہوں، مجلس لوٹ کے لے جاتے ہیں۔''

رستم علی مزے میں آگئے۔ ایک دم سے دو تین گھونٹ چڑھا گئے اور اپنی ہچکولے کھاتی گردن کو کالر کے ساتھ ایک دو مرتبہ گھما کے کچھ اعتماد پیدا کرتے ہوئے فرمائش داغی:

''شیخ صاحب اگر زحمت نہ ہو تو ایک لطیفہ اور سنائیے۔''

امجد نے کہا: ''ہاں! شیخ صاحب، ہو جائے ایک اور۔ رستم صاحب نے کون سی روز روز فرمائش کرنی ہے۔''

شیخ مسعود نے کہا: ''اچھا تو سنو بھئی! ایک جنگل میں شیر اور گدھا رہا کرتے تھے۔ ایک روز کیا ہوا کہ.....''

میرا خیال ہے کہ ایئر کنڈیشنر کی آواز سوتے میں میرے دماغ میں ایسی لہریں پیدا کرتی رہتی ہے جو بالآخر کسی خوفناک خواب کی صورت اختیار کر کے میرے ذہن کے پردے پر چھا جاتی ہیں۔ لیکن ایک اور بات ہے کہ ایئر کنڈیشنر کی آواز ہی تو ایک ذریعہ ہے جو ہمیشہ مجھے خواب کی اذیت سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے آیا کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جگانے والی آواز کی غیر موجودگی مجھے صبح دینو کے آنے تک خواب کے دوزخ میں پڑا جلتا رہنے دے اور میری یہ چالاکی ناقابلِ برداشت اذیت کے وقفے کو الٹا اور زیادہ طویل کر دے۔

بیرے نے آکر رستم علی کو ایک چٹ دی جو انہوں نے مسل کر جیب میں ڈال لی اور ''ایکسکیوز می'' کہتے ہوئے گلاس تھامے باہر نکل گئے۔ چند منٹوں کے بعد وہ ایک بڑے سرکاری انجینئر اور اپنی بیگم کے ساتھ بار کے دوسرے کونے میں کھڑے تھے۔ اور جج صاحب ان کا فرمائش کردہ لطیفہ سنا رہے تھے۔ البتہ رستم علی صاحب اگر وکیل ہوتے تو ان کے لیے، کسی انجینئر کے بلانے پر اس طرح درمیان میں سے لطیفہ چھوڑ کر جانا مشکل ہو جاتا۔

''شیر نے کہا، میاں گدھے! تمہاری عقل وفہم کی دھوم تو پورے جنگل میں ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس مشکل کا کیا حل نکالا جائے۔ گدھے نے اپنے بڑے بڑے کانوں سے ایک تالی سی بجائی، نتھنوں سے پھرررپھررر کیا اور گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سوچ سے برآمد ہوا اور..........'

میں نے علیز پر ایک نظر ڈالی۔ بیگم شمیم رستم علی انداز اور مسکراہٹ کا وہی ہتھیار اس انجینئر پر بھی آزما رہی تھیں جو انہوں نے بل پر استعمال کیا تھا۔ اونہہ! ان کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار ہے جس سے ہر شکار کو مارنا چاہتی ہیں۔ یہ بات نہیں، جو گڑ دیے سے مرتا ہو اسے زہر دینا کیا ضروری ہے؟ شکار جتنا طاقتور، ہشیار یا چالاک ہو، ہتھیار بھی اتنا مہلک و موثر اور تیز استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو شکار بہت مکار ہو اور کسی طرح ڈھب پر آتا ہی نہ ہو تو

اسے چت کرنے کے لیے بے چاری کو اس ہتھیار کو بھی آخر بے نیام کرنا ہی پڑتا ہوگا جس کے لیے بیڈروم ضروری ہوتا ہے۔

بیڈروم۔ جہاں لیٹ کے خوفناک خواب آتے ہیں۔ میں آج رات سوؤں گا ہی نہیں اور بتی روشن رہے گی۔ میں ان خوابوں کو مجبور کردوں گا کہ ننگے ہوکر میرے سامنے آئیں تاکہ میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ اپنے ہاتھوں سے ٹٹولوں، محسوس کروں۔ اپنے کانوں ان کی آوازیں سنوں اور پھر اگر ان میں کوئی حقیقت ہے تو اپنے آپ کو ان کی کربناک اور خوف ناک حقیقت میں جذب کردوں۔ ہمیشہ کے لیے خاموشی سے اپنا آپ ان کے سپرد کر دوں، جس طرح تمام گنہگار ابدی جہنم میں ایک خاموشی سے، صبر سے، اپنی قسمتوں پر شاکر، اپنے نصیبوں پر قانع جذب ہوجائیں گے۔ یا پھر ان خوابوں سے مجھے مستقل طور پر چھٹکارا مل جائے گا۔ آخر اس روز روز کی دانتا کل کل کو کسی طور تو ختم کرنا چاہیے۔

پھر قہقہے بلند ہوئے، بار میں کھڑے دوسرے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بیگم شمیم نے تیوری چڑھائے ہم پر ایک سلگتی ہوئی نظر ڈالی جیسے ہمارے گنواروں کی طرح ہنسنے پر احتجاج کر رہی ہوں۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں، جان پہچان کا اعتراف ہوا۔ دوسرے ثانیے وہ اپنے گروہ میں تھیں۔ میں اسی طرح گنواروں کی طرح ہنسے جا رہا تھا، دوسروں سے بھی قدرے اونچی آواز میں، شاید شمیم کو چڑانے کے لیے۔ مجھے جیب سے رومال کھینچتے ہوئے دیکھ کر امجد نے کہا: ”آج تمہیں پسینہ بہت آ رہا ہے؟“ پھر خود ہی جواب دیا: ”اچھا ہے۔ اس سے مسام کھل جائیں گے۔“ اتنا پوچھ لینے کے بعد میری کرب ناک حالت میں اس کی دوستانہ دلچسپی اور ہمدردی کا حق گویا مکمل ہو گیا اور اس کے بعد وہ شیخ صاحب سے ایک اور لطیفہ سنانے کی فرمائش کر رہا تھا۔

آج رات کو گھر آ کر میں نے ویسا ہی کیا جیسے سوچا تھا۔ ایئر کنڈیشنر بند کر دیا، بتی جلتی رہنے دی اور لباس تبدیل کیے بغیر جاگتے رہنے کے پختہ ارادے سے کرسی پر ڈٹ کے بیٹھ گیا۔ مگر اس ساری اسکیم کا کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سویا بھی، خواب بھی آیا

اور ایئر کنڈیشنر بند ہونے کے باوجود ڈر کے اٹھا بھی۔ آج کا خواب گذشتہ رات کے خواب جتنا پیچیدہ و پراسرار تو نہ تھا البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سا زیادہ بھیانک تھا۔ مٹیالے رنگ کا ایک دریا تھا جس میں اس قدر طغیانی ہے کہ وہ اپنے کناروں سے باہر اچھل اچھل کر چل رہا ہے۔ میں اس دریا کے درمیان میں جہاں پانی کا بہاؤ شدید تیز اور بھنوردار ہے، بہتا چلا جا رہا ہوں۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر ہوا میں اٹھایا ہوا ہے اور مدد کے لیے چلا رہا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے بیل کی دم نہایت مضبوطی سے پکڑی ہوئی ہے (عجیب بات ہے کہ وہ بیل حمیدہ کے والد کا بیل تھا جو اس نے نہایت شوق اور محنت سے پالا ہوا تھا اور جسے وہ میلہ مویشیاں پر اپنی برتری اور سربلندی کے اظہار کے طور پر لے کر جایا کرتا تھا۔ جب اس کے بیل کو انعام ملتا تو وہ انعام کو اس تفاخر اور شان سے سر پر رکھے ڈھول کی تان پر ناچتا ہوا گاؤں کی گلیوں کا چکر لگاتا جیسے وہ اس کی ذاتی خوبصورتی، طاقت اور صحت کا نشان ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے بیل کے نتھنوں میں رسیاں ڈال کر دونوں طرف سے ایک ایک آدمی نے پکڑا ہوتا اور اسے بہ دقت قابو میں رکھتے ہوئے قدم قدم چلا کر لیے آتے ہوتے۔) میں بیل کو ہانک کر کسی ایک کنارے کی طرف لے جانا چاہتا ہوں لیکن وہ اپنی بے پناہ طاقت کے باوجود کسی بھی طرف رخ بدلنے سے قاصر ہے اور پانی کے ریلے کے سامنے بالکل بے بس بہا چلا جا رہا ہے۔ صرف اس کی تھوتھنی پانی سے باہر ہے اور غرق ہونے سے بچنے کے لیے اس کی ٹانگیں نہایت سرعت سے حرکت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور ہر لحظہ اس کے نتھنوں میں تیزی سے آتی جاتی ہوا پھوں پھوں کی آواز پیدا کر رہی ہے۔ مجھے اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہے کہ میری زندگی بھی اس وقت تک ہے جب تک کہ بیل کا دم باقی ہے۔ ہم دونوں کے سوا دور دور تک کسی انسان یا حیوان کا کوئی نشان نہیں، صرف کبھی کبھار کوئی پرندہ اوپر سے قطعی لاتعلقی کے ساتھ اڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔ دفعتاً سامنے ایک پل نظر آتا ہے جس پر کھلونوں کی طرح کے چھوٹے چھوٹے انسان چل پھر رہے ہیں۔ میں بچاؤ بچاؤ کی آواز بلند اور تیز کر دیتا ہوں۔ پل نزدیک آ جاتا ہے۔ کچھ لوگ متوجہ ہو جاتے

ہیں۔ وہ دوسروں کو بتاتے ہیں اور پل پہ ایک جمگھٹا اکٹھا ہو جاتا ہے جو نہایت دلچسپی سے ہمیں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا دیکھتا رہتا ہے۔ میں پکارتا ہوں: ''رسی پھینکو، رسی پھینکو۔'' (تاکہ اس موقع پر خود سلامتی کی حدود میں آ جاؤں اور اتنی دور تک اپنے بچا کے لانے والے کو اس کی قسمت پر چھوڑ دوں۔) کوئی رسی نہیں پھینکتا۔ پل کے قریب پہنچ کر سب چہروں پر حسرت سے نظر دوڑاتا ہوں اور 'رسی پھینکو، رسی پھینکو' کی رٹ لگائے رکھتا ہوں۔ اگرچہ دل میں بخوبی جانتا ہوں کہ کوئی رسی نہیں پھینکے گا۔ سامنے نیلے آسمان پر خاموش، چپ چاپ، اپنے محفوظ ہونے پر مطمئن یا زیادہ سے زیادہ ہماری حالت پر مستعجب رنگا رنگ چہرے جڑے ہیں۔ ان سینکڑوں چہروں میں کوئی شناسا چہرہ نہیں؟ ہاں! ایک ہے۔ محسن کا چہرہ، میں ایک اعتماد سے چیخ کر آواز دیتا ہوں: ''محسن! رسی پھینکو۔'' وہ صرف آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیتا ہے۔ میں بیل کی دم پکڑے پل کے نیچے سے گزر جاتا ہوں۔ ٹوٹتے دم والے بیل کی تھوتھنی پہلی مرتبہ پانی میں ذرا سی ڈوب کر ابھر آتی ہے۔ مجھے ایک ہلکا سا غوطہ آتا ہے۔ موت سے گویا ہتھ جوڑی ہو گئی۔ چند ثانیوں کے لیے بیل پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے تیرتا ہے اور پھر دوسرا غوطہ کھاتا ہے، پھر تیسرا، پھر چوتھا، دم ہاتھ سے گئی۔ میں مٹیالے پانیوں میں کہیں گرتا، گرتا چلا جاتا ہوں کہ تڑک سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ سامنے بستر لگا ہے اور جیکی میرے پاؤں کے قریب فرش پر سویا ہے۔ اس گرم کمرے میں مَیں آدھا کرسی کے بازو پر لٹکا ہوا ہوں اور بدن پسینے سے شرابور ہے۔ آنکھیں تک پسینے میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ محسن یکا یک کہاں سے یاد آ گیا؟ وہ تو چھٹی جماعت میں کوئی سال بھر کے لیے میرا اہم سبق رہا تھا۔ اس کا باپ کہیں سے تبدیل ہو کر ہمارے گاؤں کے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر آلگا تھا۔ محسن بہت بھولا بھالا، سیدھا سادا لڑکا تھا۔ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا اور شرارت کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے سبب بہت لاڈلا تھا، اس لیے گھر سے باہر کی دنیا میں ہر وقت ڈرا ڈرا سا رہتا۔ اس کے علاوہ وہ سکول میں چونکہ نیا نیا آیا تھا اور بہت شرمیلا تھا اس لیے سب سے الگ تھلگ رہتا اور میں طعنوں کے خوف سے گاؤں کے

لڑکوں سے جتنا ہو سکتا بچ کے رہتا۔ ہم دونوں تنہا تھے، اس لیے جلد دوست بن گئے۔ ایک مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم اپنے گاؤں سے میل بھر دور نہر پر صبح کے وقت نہانے چلے گئے، لنگوٹے لگا کر نہر میں کود گئے۔ پانی ہمارے کندھوں تک آتا تھا۔ ہم الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی کوشش کرتے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھال اچھال کر ہنستے۔ تھک کے کنارے درختوں کے سائے میں آ بیٹھتے اور تھوڑی دیر بعد پھر پانی میں کود جاتے۔ ماسٹروں کی نقلیں اتار کر ایک دوسرے کو دکھاتے۔ سنے سنائے جنوں بھوتوں کے قصے دہراتے۔ درختوں پر بیٹھی ہوئی پھرتیلی چڑیوں اور اداس فاختاؤں کو دیکھتے رہتے۔ ہم بہت خوش تھے، بالکل آزاد تھے۔ میں کنارے پر لگی ہوئی گھاس پر بیٹھا کنکر اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں سے پرندوں کا نشانہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس کھڑے محسن نے نہایت سنجیدہ آواز میں کہا:

''شفیع!'' میں آواز کی سنجیدگی سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے بھیگے ہوئے بال ماتھے سے چپکے تھے اور معصوم آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''کیا ہے؟'' میں بھی کھڑا ہو گیا۔

''ایک بات تمہیں بتاؤں!'' اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی نظریں میرے چہرے سے ٹکرا ٹکرا کر پھسل رہی تھیں۔

''ہاں بتاؤ۔''

''کل رسولا میرے گھر آیا تھا، چھٹیوں کا کام لکھنے کے لیے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا، جانتے ہو شفیع حرامی ہے، اپنے بھائی کا بیٹا ہے۔ یہ رسولا بڑا سور کا بچہ ہے۔ تم اس سے کبھی بات نہ کرنا، میں بھی نہیں کروں گا۔'' میں نے لحظے بھر کے لیے اسے دیکھا، جیسے مرتا ہوا ہرن اپنی آبدیدہ آنکھوں سے شکاری کو رحم طلب نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر کچھ کہے بغیر نہر میں غوطہ لگا دیا۔ میں بہت دیر تک پانی کے نیچے چھپا رہا۔ وہاں ایک بے حد دھندلا، مٹی کے رنگ کا مبہم سا اجالا پھیلا تھا جس میں کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اس خاموشی میں گزرتے ہوئے

پانی کی بے حد ہلکی سائیں سائیں اور میرے پھڑ پھڑاتے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ میں کچھ سوچ نہیں رہا تھا، کسی بے انصافی کا احساس نہیں تھا۔ صرف ایک خواہش تھی کہ میں کبھی باہر نہ نکل سکوں تا کہ میرے تجل اور شرمندہ بدن کو دوبارہ اس کی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اچھا تو یہ سبب تھا۔ محسن کے لیے اتنے سالوں کے پردے پھاڑ کر یکا یک میرے حال میں در آنے کا۔ یہ سوچ کر قدرے سکون سا محسوس ہوا کہ ان الجھے ہوئے پیچیدہ خوابوں کا کوئی سرا تو آج ہاتھ لگا۔ ممکن ہے اس طرح میں کبھی اس باہمت اور مستقل مزاج شہزادی کی طرح جس نے طلسم کے زور سے مستقل سوتے ہوئے اپنے محبوب شہزادے کے ہر ہر مسام میں چبھی ہوئی سوئیوں کو برسوں کی دیدہ ریزی کے بعد چن چن کر نکال دیا اور جیتے جاگتے محبوب کے وصل سے ہمکنار ہوئی، میں اپنے ہی بدن سے سوئیاں نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں...... تو آخری سوئی نکالنے پر ایک زندہ خوبصورت شہزادہ میرے سامنے کھڑا ہوگا اور اپنی متعجب آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھے گا کہ 'میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟'

میں خوابوں کے بھیانک پن سے اتنا نہیں ڈرتا کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر خواب چاہے کتنا ہی بھیانک کیوں نہ ہو، اس کا خوف دل سے محو ہوتے ہوتے تقریباً بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ جو چیز میرے لیے سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے وہ ایسے خوابوں کا تواتر سے ہر رات آتے رہنا ہے، جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ مجھے پتہ چلے بغیر میرے اندر ایک بہت بڑے پیمانے پر ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ جاری ہے اور کئی بہت قبیح، بدصورت، بیمار اور اپاہج قسم کی چیزیں جگہ جگہ میرے ذہن میں اپنی تخلیق کے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہیں۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھ پر کوئی ایسا عمل ہو رہا ہے جس کی بدولت کچھ عرصے بعد میں بیک وقت غلاظت پر بھٹکنے والی مکھی، ہزار پاؤں والا کنکھجورا، کلبلاتا ہوا کینچوا اور لج لج کرتی سیاہ جونک میں مبدل ہو جاؤں گا۔ جس سے نہ صرف ہر دیکھنے والے کو گھن آئے گی بلکہ مجھے خود بھی گھن آئے گی۔ اپنی گھن کے علاوہ ہر دیکھنے والی آنکھ جو گھن

الگ الگ محسوس کرے گی اس کا مجموعی تاثر بھی مجھے محسوس کرنا ہوگا۔ یہ حساب تو بہت لمبا ہو جائے گا۔ میں اسے کیونکر برداشت کر سکوں گا۔ خوابوں کے اس سلسلے کو کسی صورت ختم کرنا چاہیے، کیا کیا جائے؟ شاید کسی عورت سے پیار میری اس بیماری کا مداوا کر سکے۔

کل دن کئی بار بیگم ریحانہ شیخ کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ باندھ کر ترک کر دیا۔ صبح ضرور اس سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کروں گا اور اس رات والی بدتمیزی کی معافی مانگوں گا۔ پھر دونوں میاں بیوی کو شام کے کھانے پر مدعو کروں گا۔ ممکن ہے ان سے پھر تعلقات اسی سطح پر استوار ہو جائیں جس پر پہلے تھے۔ اس نے میری بھلائی اور بہتری کے لیے جس جذبے کا اظہار کیا تھا، وہ اس کے لگاؤ کا واضح ثبوت ہے۔ اور اگر میں کوشش کروں تو توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ لگاؤ آہستہ آہستہ محبت میں تبدیل ہو جائے گا۔ کہیں میری شراب کی لت اس معاملہ کو عروج تک لے جانے میں آڑے نہ آئے؟ نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں کہ میں شراب کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میں نے پہلی بار جب شراب چکھی تھی تو اس وقت میری عمر پندرہ برس کے لگ بھگ تھی اور اس کے بعد بیس سال تک مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی چیز ہے جس کو پیا جا سکتا ہے یا جس سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے، چہ جائیکہ اسے زندگی کا سہارا بنانے کا خیال آتا۔ پہلے تجربے میں مجھے اس کے چبھتے ہوئے کڑوے ذائقے (جواب اتنا مرغوب ہے) کے علاوہ اس کی وجہ سے قے پر قے کرنے اور کئی دنوں تک شدید طور پر طبیعت خراب رہنے کے سبب نفرت پیدا ہوئی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ جو لوگ اسے پیتے ہیں وہ کتنے احمق ہیں۔ آخر اس میں کیا رکھا ہے جو اس بدذائقہ اور بدبودار چیز کو پیا جائے۔ بھا خوشیا واقعی احمق ہے اور تمام گاؤں والے اس سے بجا طور پر نفرت کرتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب انور ابھی فیروز آباد میں ہی تھا۔ آخر مارچ کا کھٹ مٹھا موسم تھا اور میٹرک کے امتحانات کے کڑے کٹھن دن تازہ تازہ ختم ہوئے تھے۔ ہم ذہنی گھٹن اور ماسٹروں کی قید سے یکدم نکل کر، ہر قسم کی ذمہ داری سے بے نیاز ایک مکمل آزادی کے کُرّے میں پہنچ گئے تھے۔ ہم خوش تھے، بے حد مسرور تھے۔ زمین پر ہمارے پاؤں نہ پڑتے تھے۔

ہم یوں محسوس کرتے تھے جیسے ہم نے آخری رکاوٹ پار کر لی ہو اور اس کے بعد زندگی ایک سیدھی بچھی ہوئی سڑک ہو جس کے دونوں کناروں پر کھڑے گھنے پیڑوں نے گھرے سائے کیے ہوئے ہوں، اور سڑک کے دوسرے سرے پر بہشت ہو اور ہم مزے سے سیدھے سیدھے چلتے جب چاہیں وہاں پہنچ لیں گے۔ ہم بال سنوارے، رنگین تہمد باندھے، گنگناتے ہوئے گلیوں میں گھومتی لڑکیوں کو تاکتے، کبھی گاؤں سے دور کھیتوں میں نکل جاتے۔ جگہ جگہ کسان کام میں جتے ہوتے لیکن وہ ہمیں اپنے سے الگ ایک کمتر مخلوق معلوم ہوتے۔ ہم سمجھتے کہ یہ بیچارے چونکہ بنے ہی اس لیے ہیں کہ محنت کریں اور اناج اگائیں، اس لیے کسی رحم کے مستحق بھی نہیں۔ ہم گھنٹوں نہر کے کنارے شیشم کے بُور کی بھینی بھینی مست مہک میں بیٹھے، کناروں میں قید، آہستہ آہستہ چلتے، دائرے بناتے مٹیالے پانی کو دیکھتے رہتے۔ کوئی ہوا کا شوخ جھونکا دُور کسی باغ میں چمکتے ہوئے سبز پتوں اور پاکیزہ سفید کلیوں میں لدے کھڑے مالٹے کے پودوں کی تیز خوشبو کا بھبکا ہمارے نتھنوں میں چھوڑ جاتا۔ کبھی وہیں نہر کے کنارے لگی ہوئی گھاس میں آنکھیں بند کیے تصورات کی دنیا میں کھوئے لیٹ جاتے۔ (تصورات کی دنیا بھی کتنی حسین ہوتی ہے، جو مانگو سو پالو۔ الہ دین کا چراغ تو جن کی مدد سے مالک کو انواع و اقسام کے کھانے، شاندار محل اور جذبات کو بے قابو کر دینے والی خوبصورت عورتیں مہیا کر سکتا ہے مگر اس دنیا میں تصور کے زور سے تلخ ماضی تک کو مٹا کے اپنی مرضی کے مطابق نیا تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ میرے سب سے زیادہ محبوب دو تصورات ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ مجھے اپنی ماں کے علاوہ کسی بھی اور عورت نے جنم دیا تھا اور دوسرا یہ کہ حمیدہ کا جنسی ساتھی نذیر نہیں میں تھا۔ افسوس، سوچوں میں حالات چاہے کتنے ہی دل خوش کن کیوں نہ مہیا کر لیے جائیں مگر حقیقت کا ایک تیز کانٹا کہیں دُور ذہن میں پڑا خلش پیدا کرنے کے فرض انجام دیتا رہتا ہے۔) ہم اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرتے تھے جیسے کوئی گھوڑا اپنی پشت پر سے سوار کو گرا کر محسوس کرتا ہو گا۔ آخر اتنی فراغت سے ہم تنگ آ گئے اور سوچا کہ اس سپاٹ زندگی میں کسی طرح ہنگامہ بازی اور مہم جوئی کو داخل کرنا

چاہیے۔ سوچتے سوچتے اپنے باغیانہ پن کے اظہار کے لیے ہم نے شراب پینے کے خیال کو بڑا محفوظ طریق بغاوت سمجھا۔ کیونکہ اس طرح ہم باغی ہونے کی سنسنی سے بہرہ ور بھی ہو لیں گے اور اسے خفیہ رکھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ ہم نے اس سکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے شیرو میراثی کی مدد اور راہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک تو وہ بچپن میں ہمارے ساتھ کھیلا ہوا تھا، دوسرا وہ نمبردار کا ذاتی ملازم تھا۔ نمبردار کے ہاں جب مہمان آئے ہوتے تو ڈیرے کی بلند چاردیواری کے اندر شراب چلتی، ناچ گانا ہوتا اور شیرو میراثی مہمانوں کی خدمت خاطر اور دیکھ بھال کے لیے اندر موجود ہوتا۔ ہم نہر کے سایہ دار، خنک خنک کنارے سے شیرو میراثی کو پکڑنے کے لیے چل پڑے۔ وہ حویلی کی بلند و بالا ڈیوڑھی کا پھاٹک چوپٹ کھولے وہاں ٹانگ پر ٹانگ دھرے کھری چارپائی پر لیٹا، مٹھی میں سگریٹ دبائے لمبے لمبے کش کھینچ رہا تھا اور آنکھیں بند کیے دنیا سے بے نیاز چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔

میں نے آواز دی: ''اوشیرو۔''

شیرو نے اٹھتے ہوئے کہا: ''آؤ جی! پڑھاکو لڑکو۔ تم آج ادھر کیسے بھول پڑے؟''

''ایک کام ہے یار۔''

اس نے اپنے پالش شدہ کالے بوٹ جیسے چہرے پر بالوں میں سے رس کر پھیلا ہوا تیل آستین سے پونچھا: ''حکم کرو بادشاہو۔''

''یار شراب چاہیے۔''

''جتنی کہو شراب حاضر کر دیں مگر ایک شرط ہے۔''

''کیا؟''

''میں بھی ساتھ پیوں گا۔''

''منظور ہے۔''

''اچھا تو عشاء کی نماز کے بعد یہیں آ جانا۔ تم جانتے ہو ہمارے گاؤں میں تو کوئی نکلتا نہیں۔ چک ۸۶ سے جا کر لانی پڑے گی۔ خیر کوئی بات نہیں، وہ کونسا ایسا دور ہے۔ تم بس

پانچ روپے اپنے ساتھ لیتے آنا۔ اس سے کم میں وہ سٹور کا بچہ نہیں مانتا۔"

"ٹھیک ہے۔"

نکھری ہوئی چاندنی میں ہم تینوں کھیتوں کے بیچوں بیچ، پیچ دار پگڈنڈی پر چک ۸۶ کی جانب ایک قطار میں تیز تیز جا رہے تھے۔ میں اور انور مستعدی سے چلے بھی جا رہے تھے اور ممنوعہ پھل کو چکھنے والی ہچکچاہٹ اور کچھ کر گزرنے والی متضاد کیفیتوں سے بھی دوچار تھے۔ مجھے تمام ماحول سنسنی زدہ نظر آ رہا تھا۔ چاندنی ایک ایسا پل دکھائی دے رہی تھی جس میں کوئی بہت بڑا ابلور دھماکے سے گر کر بکھر گیا ہو اور وہ پل منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ لیکن اس دھماکے کی آواز ہم تک نہیں آئی کیونکہ یہ عمل کہیں دور وقوع پذیر ہوا اور اب کسی بھی لمحے اس کی فاتحانہ آواز ہمیں آن دبوچے گی۔ سنہری ہوتی ہوئی گندم کے کھیت چاندنی میں پھیکے پھیکے، بدرنگ اور بے جان نظر آتے تھے۔ ادھر ادھر کھڑے درخت اپنی مرضی کے خلاف محض سحر کے زور سے وجود میں آئی ہوئی کوئی ایسی مجبور، غیر فطری، بیمار مخلوق دکھائی دیتے تھے جو بے تابی سے اپنے ساحر کے منہ سے "فنا" کا لفظ سننے کی منتظر تھی کہ جلد از جلد واپس ماحول میں تحلیل ہو سکے۔ شیرو حسب عادت اپنی بلند و بالا سریلی آواز میں گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"تیرا اچھا نہیں چھڈنا، بھانویں لگ جاون ہتھکڑیاں......"

اس کے ذہن میں سینکڑوں ماہیے اور گیت محفوظ تھے۔ تمام راستہ وہ مسلسل ایک کے بعد دوسرا ماہیا گاتا رہا۔ کبھی کبھی بیچ میں کوئی گیت چھیڑ دیتا (اس کی یادداشت اور آواز کی خوبصورتی پر ہمیں ابتدا میں تعجب ہوا، بعد میں غالباً جلاپے کی وجہ سے کچھ الجھن سی ہونے لگی۔) اسے گانے کا خبط تھا، شاید دنیا کی توجہ اپنی بدصورتی سے ہٹانے کے لیے اس کے ہاتھ یہ گُر لگ گیا تھا کہ ہر وقت دنیا کے سامنے اپنی آواز کا حسن پیش کیے رکھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ سوتے میں بھی گاتا ہی رہا کرتا۔ میں اور انور بوکھلائے ہوئے تھے کہ آج ہم یہ کیا کرنے والے ہیں؟ لیکن حیرت اس بات کی ہے کہ اس کے باوجود ہم چلے بھی جا رہے تھے۔ آخر وہ کیا جذبہ تھا جس کی بدولت کئی بار یہ بات میری نوکِ زباں تک آ کر لوٹ گئی کہ

'چلو جانے دو پھر کبھی سہی۔' ہم دراصل ان تمام اقدار کا منہ چڑانے پر تلے ہوئے تھے جو پیدائش کے وقت سے لے کر مستقل ہم پر لادی جاتی رہی تھیں۔

میں نے پوچھا: "شیرو! تُو نے پہلے کبھی پی ہے؟"

اس نے گانے کی پناہ گاہ سے نکل جواب دیا: "ہاں! ایک دو مرتبہ ایسا ہوا کہ مہمان پی پی کے الٹا ہو گیا تو اس کے گلاس میں بچی ہوئی شراب گرانے کی بجائے میں آنکھ بچا کے کھینچ گیا۔"

"کیسی تھی؟"

"اچھی تھی۔"

"سنا ہے کڑوی بہت ہوتی ہے۔"

"ہاں! کڑوی تو ہوتی ہے مگر بعد میں جو مزہ آتا ہے نا۔ وہ اصل بات ہوتی ہے۔"

"کیا مزہ آتا ہے؟"

"یار تم دونوں کیوں بے صبرے ہو رہے ہو۔ پانچ منٹ کی تو بات ہے، خود ہی سب پتہ چل جائے گا، ذرا جلدی قدم اٹھاؤ۔ وہ سالا سو گیا تو پھر نخرے کرتا ہے، اٹھتا نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر تان لگانی شروع کر دی۔

میں نے تیسری بار جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا کہ میاں جی سے چرایا ہوا پانچ کا نوٹ کہیں گِر تو نہیں گیا، ابھی تک موجود تھا۔

شیرو نے دفعتاً نعرہ لگایا: "وہ رہا چک ۸۶۔"

سامنے چاندنی میں ڈوبے ہوئے مکانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ہم منزل پر پہنچنے سے اس طرح خوش تھے جیسے عمر بھر ہم ہر کام محض اس لیے کرتے رہے تھے کہ آخر ایک دن چک ۸۶ پہنچ کے دم لیں گے۔ یہ ہمارے دیہات سے چھوٹا تھا مگر ہر لحاظ سے باقی سب دیہاتوں جیسا ایک دیہات تھا۔ کچے گھروندوں پر جا بجا جڑے اپلے چاندنی میں بسور رہے تھے۔ دھول سے بھری گلیاں اور ان میں گھروں سے بہہ کر نکلے ہوئے غلیظ پانی نے جا بجا

کیچڑ کیا ہوا تھا۔ احتیاط کے باوجود ہمارا ہر چوتھا قدم غلیظ کیچڑ میں دھنس جاتا اور ہم گالیاں دے کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے آگے چلے جاتے۔ دھواں، کھاتے، جانوروں اور ان کے بول و براز کی ملی جلی بوؤں سے گلیاں مہک رہی تھیں۔ ایک بند کواڑ پر شیرو نے دستک دی۔

ایک زناٹے دار نسوانی آواز نے پوچھا:

''کون ہے؟''

شیرو نے کہا: ''بھا گاما کہاں ہے؟''

''بھوسے کے کُپ کے پاس سویا ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔''

شیرو چل پڑا، اسی مستعدی اور تیز رفتاری سے، اور ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چلے جارہے تھے جیسے انجن کی رہنمائی میں ڈبے پابندی سے اس کے پیچھے کھنچتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گاما کُپ کے پاس چارپائی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ شیرو نے اسے جگایا۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا: ''کون ہو، کیا بات ہے؟''

''میں شیرو ہوں۔ بوتل لینی ہے۔''

''نمبردار نے بھیجا ہے؟''

''ہاں۔''

''ہمیشہ آدھی رات کو آ کر تنگ کرتے ہو۔ میری آنکھیں دکھنی آئی ہوئی ہیں۔ کل سے نیند نہیں آئی۔ اب چھٹانک دو چھٹانک شراب پی کر ذرا لیٹا تھا کہ شاید نیند آ جائے مگر ادھر آنکھ لگی اور ادھر تم نے آ کر جگا دیا۔ یار آدمی نے کچھ لینا ہو تو وقت پر آئے۔''

شیرو نے اپنی آواز میں تاسف کا لہجہ پیدا کرتے ہوئے کہا: ''بس! بھا گامے کیا بتائیں دیر ہو ہی گئی۔ تم جانتے ہو اتنی دور سے آنا ہوتا ہے۔ اب مہربانی کر ہی دو۔''

''اچھا، نکالو پیسے۔''

شیرو نے مجھے آواز دی: ''شفیع! دینا بھئی پانچ روپے۔''

اب گامے کی نظر ہم پر پڑی۔ کچھ گھبرائی ہوئی آواز میں شیرو نے آہستہ سے پوچھا۔

''یہ سفید کپڑوں والے کون ہیں؟''

''کوئی نہیں، اپنے ہی آدمی ہیں۔'' شیرو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گامے نے ہمارے قریب آ کر ماچس جلا کر اچھی طرح ہمارے چہروں کا معائنہ کیا۔ جب تسلی ہو گئی کہ خطرے والی کوئی بات نہیں تو پانچ کا نوٹ مٹھی میں دبا کر کُپ کے آگے گھس گیا اور بھوسے میں سے بوتل نکال کر لے آیا۔

چک ۸۶ کی آبادی سے ذرا باہر نکلے تو انور نے بڑی تمکنت سے کہا: ''ابے او! میراثی ادھر لا ذرا چکھ کے تو دیکھیں کہ یہ آخر ہے کیا چیز۔''

شیرو نے اپنی رفتار قائم رکھتے ہوئے جواب دیا: ''اونہوں۔ یہ شراب ہے مصری کا شربت نہیں اور یہ جگہ چک ۸۶ ہے تمہارے گھر کا صحن نہیں۔ پی کے ذرا بہکے تو انہوں نے تمہارے ٹا سے کے تہمد اٹھا کے تمہارے سروں پر ڈال دینے ہیں اور تمہارا وہ حشر کرنا ہے کہ عمر بھر ہاتھ لگا لگا کر دیکھا کرو گے۔ تمہارے جیسے لڑکے تو اللہ انہیں دے۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔''

ہم نے چک ۸۶ والوں کے جرائم پیشہ ہونے کے متعلق پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس لیے شیرو کی بات سن کر واقعی خوفزدہ ہو گئے اور جھٹ سے کود کر اس سے آگے ہو گئے۔ وہ ہنس رہا تھا، خوب زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ ہم اس کے قہقہوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی راہ چلتے رہے۔ چڑھتی جوانی کا خمار، اپنے مرد ہونے کا نیا نیا پُر غرور احساس ذہن سے اس طرح نکل گیا جیسے ٹائر سے ہوا نکل جاتی ہے۔ اب نکھری ہوئی بھرپور چاندنی رات میں ہمارے سامنے اپنے گاؤں کے اونچے نیچے، کچے پکے خاموش مکان پھیلے ہوئے تھے۔ درمیان میں ادھر ادھر اکا دکا درخت فلسفیانہ سکوت طاری کیے کچھ سوچتے ہوئے کھڑے تھے۔ شاید اپنی پابستہ زندگی کی بدولت احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر یا اپنی کم مائیگی کے پیشِ نظر، بھرپور جوان چاندنی سے سجی ہوئی رات سے نپٹنے کے لیے کسی شباب پرور، طلسماتی دوا کے متعلق سوچ رہے تھے۔ چاندنی رات تو ان پر برس ہی رہی تھی اور یوں درخت اور

رات باہم دیگر پیوست بھی تھے۔تو پھر درختوں کو کیا فکر تھی؟ان لوگوں کا بھی تو بدنصیبی کا اپنا ایک حصہ ہوتا ہے جنہیں تمام دنیا خوش نصیب قرار دیا کرتی ہے۔گاؤں کے نزدیک پہنچتے ہی ہماری کچھ ہمت بندھی۔ میں نے اور انور نے چک ۸۶ کی طرف منہ کر کے، تہمد اٹھا کر ننگے ہو کر دکھایا اور اس طرح اپنی دانست میں چک ۸۶ والوں کی جس قدر تذلیل کر سکتے تھے، کی۔ شیرو پھر ہنسنے لگا اور طنزاً بولا: ''اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے، وہاں کچھ کر کے دکھاتے تو کچھ بات بھی تھی۔''

ہماری یہ حرکت حقیقتاً اس کتے سے مشابہہ تھی جو دم اٹھائے اپنی گلی میں شان سے ٹہلتا ہے۔ گویا تمام جہان اس کے زیرِ نگین ہے اور اپنے اقتدار کے مزے لوٹنے کے لیے جگہ جگہ ٹانگ اٹھا اٹھا کر پیشاب کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے تجویز دیتے ہوئے کہا: ''شیرو! وہاں نمبردار کے ڈیرے پر جا کر نہ پی لیں، وہ تو اس وقت گھر ہوگا؟''

''ڈیرہ رات کو سُونا تو نہیں ہوتا، دو چار مزارع تو وہاں سونے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ ایک بات تمہیں بتاؤں؟ اگر گاؤں کی آبادی میں کہیں بھی بیٹھ کر پی تو بات چھپی نہ رہ سکے گی۔ آؤ! جیونے والے کھوہ پر چلتے ہیں وہاں رات کیا دن میں بھی خال خال ہی کسی آدمی کا گزر ہوتا ہے اور یہاں سے ہے بھی نزدیک۔''

ہم نے اپنا رخ جیونے والے کھوہ کی جانب موڑ دیا اور ناک کی سیدھ فصلوں اور ہل چلے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ چھدرے پیپل میں سے چھن چھن کے آتی چاندنی نے کنوئیں اور اس کے اردگرد چتکبری چادر بچھائی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ ہر طرف مکمل سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہمارے گناہ آزمانے پر تلے ہوئے دلوں میں طوفان بپا تھے۔ شیرو نے کہا: ''پینے کے لیے ہم ساتھ میں کچھ بھی نہیں لائے، کوئی گلاس یا کٹورہ وغیرہ۔''

انور نے کہا: ''ارے چھوڑو۔ گلاس، کٹورہ کیا کرنا تھا۔ ایسے ہی بوتل سے منہ لگا کر باری باری پی لیتے ہیں۔''

شیرو نے جواب دیا: ''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے اسے ہمیشہ پانی میں ملا کر پینا چاہیے ورنہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔''

میں نے کنوئیں کے اندر نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''پانی تو بہت ہے مگر ڈول نہ ڈوری۔ نکالیں کیسے؟'' شیرو نے کہا: ''اب کیا ہو سکتا ہے، اللہ کا نام لے کر ایسے ہی پیتے ہیں۔ دیکھا جائے گا جو ہوگا۔'' پھر بوتل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''لو بھئی شفیع! رقم تمہاری لگی ہے، تم ہی شروع کرو۔''

میں گھبرا رہا تھا، تجربے کا پہلا شکار بننے سے۔ ان دیکھے ان جانے نتائج سے۔

''نہیں! کوئی اور شروع کرے۔ میں بعد میں لوں گا۔''

انور اور شیرو نے اصرار کیا: ''نہیں نہیں! پہلے تم پیوگے۔ بس ذرا سی ایک بار چکھ لو۔''

بہت گہرے رنگ کی تقریباً سیاہ، بوجھل بوتل میرے ہاتھوں میں تھی۔ کھینچ کر تکا نکالا اور ڈرتے ڈرتے ایک گھونٹ کے برابر شراب منہ میں جمع کی۔ کڑواہٹ تو تھی مگر کچھ ایسی ناقابلِ برداشت بھی نہیں تھی۔ پھر حوصلہ باندھ کر حلق سے نیچے اتارا تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر جو کچھ بھی ہے، معدہ، انتڑیاں، جگر سب کچھ بخارات میں تبدیل ہو کر میرے ناک کے راستے نکل جائے گا۔ کھانسی کا ایک دورہ اٹھا اور بوتل شیرو نے بڑھ کر تھام لی۔ اس نے چاند کی طرف بوتل کو بلند کر کے کہا: ''یار! پورا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا۔ کچھ تو اور پیو۔''

میری آواز حلق میں الجھ کر رہ گئی اور بدقت اتنا کہہ سکا کہ اب کوئی اور، لوٹ کر پھر جب اپنی باری آئی تو میں نے محسوس کیا کہ دوسری مرتبہ اتنی بری حالت نہیں ہوئی جتنی کہ پہلے مرتبہ ہوئی تھی۔ کنوئیں میں جھانک دیکھا۔ روشن چاندنی میں کنوئیں کے دائرے کی جو قوس نظر آ رہی تھی وہاں جمی ہوئی کائی میں سے کہیں کہیں اداس اینٹیں اپنی آبدیدہ، منتظر آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔ دور نیچے میں آئینے کی طرح ٹھہرا ہوا ساکت پانی تھا اور اس میں چاند جماد مک رہا تھا۔ شیرو منڈیر پر آلتی پالتی مارے، کان پر ہاتھ دھرے نہایت بے نیازی کے انداز میں کسی سے اعلانِ عشق کر رہا تھا:

"چٹا ککڑ بنیرے تے......
ریشمی دوپٹے والیے...... منڈا عاشق تیرے تے!"

میں نے کنوئیں میں منہ ڈال کے یونہی ایک اُووو کی آواز نکالی جو کنوئیں نے فوراً واپس میرے کانوں پر دے ماری۔ کنوئیں کی آواز کا یہ کوئی میرا پہلا تجربہ نہ تھا۔ میں بچپن سے اس چیز سے آگاہ تھا لیکن آج جو اس نے لطف دیا وہ بالکل نرالا تھا۔ احساس نے اب کے بالکل نئے رنگ اور نئی کیفیت میں اس کی ترجمانی کی۔ میں حیران تھا کہ اتنا عرصہ میں آوازوں اور ان کی واپسی کے اتنے متنوع اور مسحور کن اندازوں سے کیونکر ناواقف رہا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو آواز دی: "شیرو! انور! ادھر آؤ۔" کنوئیں نے اسی تحکمانہ انداز میں دہرایا: "شیرو! انور! ادھر آؤ۔" میری ہنسی چھوٹ گئی، حالانکہ اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے جا کر شیرو کو ہلایا۔ وہ نہایت دلدوز آواز میں کسی انجانے، تخیلاتی محبوب کو پکار پکار کر اپنی حالتِ زار بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا:

"دو پتر اناراں دے
ساڈا دکھ سن کے چناں روندے پتھر پہاڑاں دے۔"

اپنے تصورات میں گم شیرو نے یوں جھنجھوڑے جانے پر بیزاری سے پوچھا:
"کیا ہے؟"
میں نے کہا: "کنوئیں میں آواز لگا کے دیکھو۔ بڑا مزا آتا ہے۔"
اس نے پوچھا: "انور کہاں ہے؟"
"یہیں ہوگا کہیں۔"
شیرو تڑپ کر منڈیر سے اترا اور زور سے آواز لگائی: "انور" قریب ہی سے دھیمی آواز میں جواب آیا: "ہاں۔"

انور کنوئیں کی منڈیر پر لیٹا پیپل کے پتوں میں سے چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور بوتل دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر پیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ شیرو نے اسے زبردستی نیچے اتارا

اور کہنے لگا: "اب کنوئیں کے پاس ٹھہرنا خطرناک ہے۔ چلو ادھر کھلے کھیت میں چلتے ہیں۔"
میں نے کہا: "پہلے تینوں مل کر کنوئیں میں قہقہے لگائیں، پھر چلیں گے۔"

ہم پاس پاس کھڑے ہو کر منڈیر پر جھک گئے، کنواں بھی بہت دیر تک ہم پر قہقہے لگاتا رہا۔ پھر ہم تینوں بازو میں بازو ڈالے ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے پتھروں جیسی چال میں اس طرح ہنستے ہوئے چلے جا رہے تھے جیسے یہ پھیلی ہوئی چاندنی، بکھرے ہوئے درخت، بچھے ہوئے کھیت اور فصلیں ہم تین دیوتاؤں نے اپنی ذات کے اندر سے نکال کر تخلیق کیے ہوں اور اپنے منتہائے فن اور کمالِ عروج سے مطمئن ہنستے ہوئے چلے جا رہے ہوں کہ تخلیق کرنے کے لیے تو اب کچھ باقی نہیں رہا، اس لیے اور خوب کھل کر ہنسو۔

ہم بوتل سے باری باری گھونٹ پیتے جا رہے تھے کہ ایک تازہ ہل چلے کھیت میں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو نے ہمارے قدم پکڑ لیے۔ ہم اس کی بھربھری مٹی میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور پھر وہیں گر گئے۔ صبح پو پھٹ رہی تھی کہ شیرو نے ہم دونوں کو اٹھایا۔ ہمارے کپڑوں اور جسم سے قے کی بو کا تعفن اٹھ رہا تھا اور مٹی میں لت پت کپڑوں کا رنگ مٹی کا ہو گیا تھا۔ سر درد سے پھٹ رہے تھے۔ دلوں کی دھڑکن قابو سے باہر تھی۔ رات خدا جانے جوتے کہاں پاؤں سے اتر کر ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اگرچہ جسموں میں قدم اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ لیکن جوتوں کو تلاش کرتے ہوئے واپس کنوئیں تک جانا پڑا۔ ایک ایک کر کے جوتے مل گئے۔ میں اور انور خاص طور پر اپنے کیے پر بے حد افسردہ، رنجیدہ اور نادم تھے۔ ہم نے کیا حماقت کی؟ کیا بے ہودگی کی، کس قدر بڑی غلطی کی، جا کر کپڑے دھوئے اور نہائے اور اپنے اپنے ماں باپ کی جوتیاں کھانے کے لیے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی مجھے اگر ریحانہ کا (بلکہ اس معاملہ میں، میں یوں کہوں گا کہ کسی بھی عورت کا) سچا، ٹوٹ کر چاہنے والا پیار نصیب ہو جائے تو میں شراب چھوڑ سکتا ہوں۔ ہاں! خوف ناک خوابوں سے بھی جان چھڑا سکتا ہوں۔ کوئی مجھے کہیں سے

پیار کی بھیک دے دے تو میں ذہنی اور جسمانی طور پر ایک عام اوسط درجے کی صحت مند زندگی گزار سکتا ہوں۔

'تم جھوٹ بول رہے۔ شرابی جھوٹے ہوتے ہیں، دنیا کے بدترین جھوٹے!'

'ہاں یہ ٹھیک ہے، مگر خوفناک خواب دیکھنے والے تو جھوٹے نہیں ہوتے......'

'تم نے خوفناک خوابوں کا سلسلہ شروع ہونے سے بہت پہلے شراب شروع کر دی تھی۔'

'ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت خوفناک خوابوں کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میرے بدن میں ہر وقت جھنن جھنن پیدا کرتی برقی رو چلتی رہتی تھی۔ بدن کا ایک ایک ریشہ کانپتا رہتا، پھڑکتا رہتا، تڑپتا رہتا۔ رات بعد رات میری نیند کو ترستی ہوئی آنکھیں چھت کو گھورتی رہتیں۔ نظراً اگر کوئی مادی چیز ہوتی تو چھت جا بجا چھلنی کی طرح چھد گئی ہوتی۔ میرا ذہن ہر سوچ سے خالی ٹین کے زنگ آلود ڈبے کی طرح تھا جو ہوا کے زور کے آگے سڑک پر محض ٹن ٹن کا شور مچا سکتا ہے لیکن ذہن یکسر خالی ہونے کے باوجود بے چین رہتا تھا۔ جیسے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں پر جا پڑا ہو۔ میں کسی ایک جگہ پر ٹک کر پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہر دوست سے جلد اکتا جاتا، ہر مجلس سے فوراً گھبرا اٹھتا۔ تنہا ہوتا تو دوستوں کی تلاش ہوتی، دوست ہوتے تو تنہائی کے لیے جی مچلنے لگتا۔ بازار میں ہوتا تو سمندر کے سُونے کنارے کی طرف لپکتا، سمندر کے کنارے ہوتا تو بازار کی رونق کو ترسنے لگتا۔ میں خوب جی بھر کے رونا چاہتا تھا، کسی شانے پر سر رکھ کر مگر سارے شہر میں کوئی شانہ فارغ نہیں تھا۔ یہ سب کیوں تھا؟ میں نہیں جانتا۔ غالباً میری روح اور بدن شراب کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ وہ سوکھ گئے تھے۔ پیاس سے تڑخ اٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے کاروبار کے مسائل کو سلجھانے اور کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی کھو چکا تھا۔ میں ایک روز اسی طرح چہرے پر تہہ در تہہ اداسیاں جمائے مردے کی طرح ساکت و جامد اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کھلنڈرا زمیندار امجد، کپاس کی بین الاقوامی منڈیوں کی صورتِ حال دریافت کرنے کے لیے میرے دفتر آ گیا۔ اس نے میری صورت دیکھی تو وہ اپنا کام بھول

گیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر سیدھا کلب لے گیا اور بہ اصرار وہسکی کا ایک بڑا پیگ پلا دیا۔ وہ سلگتا ہوا مائع میرے اندر گیا تو پہلے پژمردہ ہونٹوں پر ہنسی بکھرنے لگی اور پھر حلق سے قہقہوں کا طوفان ابلنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ذہن کو انگاروں پر سے نہایت احتیاط سے سمیٹ کر واپس میری کھوپڑی میں ڈال دیا ہو۔ میرے ہاتھ زندہ رہنے کا گر آ گیا۔ میں بیس سال پرانی توبہ توڑنے پر نہ اس وقت نادم تھا اور نہ اب نادم ہوں۔'

'آسمان سے گر کر اگر کھجور میں اٹکنا تھا تو آسمان سے چھلانگ لگانے سے حاصل؟ اب تم ہنستے تو ہو مگر جھوٹ موٹ۔ زیادہ عادی ہو جاؤ گے تو یہ جھوٹ موٹ کی ہنسی بھی بند ہو جائے گی۔ خوابوں کا خوف تمہیں ہر وقت اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ تم اس سے جان چھڑانے کے ہزار حیلے کرتے ہو مگر یہ تم سے چمٹا رہتا ہے اور پھر خوابوں کا سلسلہ بھی تو بند نہیں ہوا، جاری ہے۔ جو کچھ تمہارے اندر ہے اسے کھینچ کر باہر کیوں نہیں لے آتے؟ تم جان بوجھ کر غلط بات کہہ رہے ہو، اندر تو کچھ نہیں صرف خلا ہے، اسے پُر کرنا چاہتا ہوں۔'

'شراب سے؟ عورت کی محبت سے؟'

'ہاں۔'

'اندر کے خلا کو صرف اندر سے ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے انڈیلی ہوئی کوئی چیز اسے پر نہیں کر سکتی۔'

'تمہیں معلوم ہے کہ شراب میری زندگی کا آخری سہارا اور واحد وسیلہ ہے اور تم نے یہ سازش صرف اس لیے کی ہے کہ میں اندرونی تعفن سے دم گھٹ کر مر جاؤں۔'

'بوکھلا کیوں گئے۔ شراب چھوڑنے کا عندیہ تم نے خود ہی ابھی ظاہر کیا تھا۔'

'ہاں! لیکن ایک شرط پر۔'

'وہ مجھے یاد ہے۔ جنسی تقاضے کی تکمیل والی......'

'تم دانستہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ میں نے کہا تھا ریحانہ......'

'یا کوئی اور عورت بھی تو کہا تھا۔'

'ٹھیک ہے۔اپنی پسند کی عورت سے محبت کرنا اور اس سے محبت کا جواب پانا میرا پیدائشی حق ہے۔تم اگر وہ مجھے دلا دو تو میں شراب چھوڑ دوں گا۔'

'بات وہی جنس کی ہوئی نا۔ روپے خرچ کرو اور جتنی مرضی عورتیں منگوالو۔ یہ سب شراب نہ چھوڑنے کے بہانے ہیں۔'

'محبت اور اس کی ضرورت بہت نازک مسئلے ہیں جسے تم جیسا عملی آدمی کبھی نہ سمجھ سکے گا۔ یہ محض جسمانی تسکین کی بات نہیں۔ یہ اس سے کہیں زیادہ عمیق اور اہم ہے۔'

'کیوں بلاوجہ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر مسئلہ جنس کا نہیں تھا تو تم نے ریحانہ کی بجائے اے۔ بی شیخ کا نام کیوں نہیں لے دیا۔ کسی عورت کی بجائے کسی مرد کا کیوں نہیں کہا۔ ذرا غور سے سنو اور بتاؤ اگر رومیو اور جولیٹ کی شادی ہو جاتی اور شبِ عروسی رومیو پر انکشاف ہوتا کہ جولیٹ تو دفعتاً تبدیلی جنس سے مرد بن گئی ہے یا اس کا الٹ ہو جاتا تو ان کی محبت کا کیا حشر ہوتا۔ مسئلہ محض جنس کا ہے جسے تم تشنگیٔ محبت کا نام دے کر پینے کے لیے جواز مہیا کرتے ہو۔ شرابی دنیا کے بدترین جھوٹے ہوتے ہیں اور تم انہی میں سے ایک ہو۔'

میں چیخا: "بکواس بند کرو۔"

باہر چائے لے کر آیا دینو گھبرا گیا: "کیا ہوا صاحب؟ کیا ہوا؟"

بیس دن ہسپتال میں رہنے کے بعد آج پہلی پھر اپنی ٹانگوں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے دینو سے کہا: "انہیں وزیٹر بک لا کر دکھاؤ تاکہ انہیں پتہ چلے کہ وہ زندگی جسے یوں شراب میں غرق کر دینا چاہتے تھے، اسے سلامت دیکھنے کے کتنے لوگ خواہشمند ہیں۔"

میں نے نظریں جھکا لیں اور شرمندگی میں رچی بسی ایک خفیف سی مسکراہٹ کئی ثانیوں تک میرے چہرے پر پھیلی رہی۔ دینو کمرے سے باہر کتاب لینے بھاگا اور لا کر پلنگ کے ساتھ لگی میز پر دوائیاں ہٹا کے رکھ دی۔

"ڈاکٹر صاحب! اب تو میں ٹھیک ہوں گھر چلا جاؤں! باقی علاج وہاں جاری

رہے گا۔"

"کم از کم ایک ہفتہ اور آپ کو یہاں ٹھہرنا چاہیے۔"

اتنی لمبی غیر حاضری سے میرا کاروبار پہلے ہی تباہ ہو چکا ہوگا۔ ایک ہفتہ اور نہ گیا تو سمجھئے کہ سال بھر کے لیے معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ ساکھ بگڑ جائے تو سنبھالنی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی ان دنوں کپاس کی تجارت کا سیزن اپنے عروج پر ہے، پل پل میری وہاں ضرورت ہوگی۔

"آپ کی اتنی بڑی فرم ہے، بے شمار کارندے ہیں کام سنبھال لیں گے، فکرمند نہ ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! اگر کارندے ہی سب کام سنبھال سکتے تو مجھے بلاوجہ سر کھپانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ منڈی کا رجحان دیکھنا۔ ملکی و غیر ملکی سیاسی حالات کا جائزہ لینا، حکومت کی بدلتی ہوئی تجارتی پالیسیوں کا پیش از وقت پتہ چلانا، بین الاقوامی منڈیوں کے بھاؤ پر نظر رکھنا، کاروباری حریفوں سے نفسیاتی اور مالی جنگ لڑنا، ان سب باتوں کو جانچتے ہوئے سال ہا سال کے تجربے کے بل پر مال بیچنا، سٹاک کرنا یا خریداری بند کرنا، یہ سب فیصلے میں ہی کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب یہ بڑا ٹیکنیکل کام ہے، کارندے بے چارے کہاں کر سکتے ہیں؟"

دینو بیچ میں بول پڑا: "ڈاکٹر صاحب! کام ہوتا رہے گا لیکن جب تک ان کی صحت ٹھیک نہیں ہو جاتی بالکل چھٹی نہ دیں اور یہ جو شراب پینے کی بیماری ہے۔ اس کو تو خدا کے واسطے کسی طرح جڑ سے نکال دیں۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "ارے احمق تجھے کیا خبر......"

ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا: "خیر تین روز تو اور ٹھہریئے۔"

میں پلنگ سے ٹیک لگا کر وزیٹر بک کے صفحے ابتدا سے الٹنے شروع کیے۔ جس دن بلکہ جس رات بے ہوشی کے عالم میں لا کر مجھے ہسپتال داخل کیا گیا تھا، کتاب اس کے دوسرے روز شروع ہوتی تھی۔ میری نظر ناموں پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ دفتر کے عملے کے

نام، کلب کے ساتھیوں کے نام، میرے ہم پیشہ اور پیشے سے متعلق لوگوں کے نام، صنعت
کاروں کے نام، تجارتی اور کاروباری لوگوں کے نام، کئی نام تو ایک آدھ مرتبہ ابھرے اور
پھر نظر نہیں آئے اور کچھ نام باقاعدگی سے ہر تاریخ میں موجود تھے۔ باقاعدگی سے نظر آنے
والے چند نام صرف میرے دفتر کے افسران کے تھے جو شاید مجھ سے اپنا قلبی لگاؤ ایک
دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش میں ہر روز میرے کمرے کے باہر
حاضری دینے پر مجبور تھے۔ میری نظر صفحے کھنگالتی چلی جارہی تھی مگر وہ نام جسے دیکھنے کے
لیے میں خاص طور پر کتاب کھولی تھی وہی ابھی تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ دسویں دن کے
صفحے پر مسز رائے۔ بی شیخ کا نام معہ دستخط اور اندراجِ وقت، 'تین بجے بعد دوپہر' کے موجود
تھا۔ میں نے اس نام سے پہلے اور بعد کے کئی ناموں کو کئی بار غور سے دیکھا کہ شاید ریحانہ
کی بجائے مسز رائے۔ بی شیخ یا مسز شیخ وغیرہ کا اندراج ہو...... مگر نہیں، میں جلدی جلدی آخر
تک آگیا۔ اس کے بعد صفحے خالی تھے، بھائیں بھائیں کرتے۔ غالباً میری صحت یابی پر
نوحہ کناں۔ ریحانہ کا نام کہیں نہ تھا۔ وہ مجھ سے ناراض تھی؟ باہمی تعلقات پر متاسف تھی؟
مجھ سے مایوس تھی؟ آخری ملاقات پر نادم تھی؟ ہاں! وہ یہ سب کچھ تھی۔ میرے اپنے
جذبات بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ اگر میری جگہ وہ یوں بیمار پڑ گئی ہوتی تو ان
حالات میں عیادت کے لیے جانے کی مجھ میں قطعی ہمت نہ ہوتی۔ اب اگر وہ یہاں
آجائے تو مجھ میں اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ حیرانی ہے کہ اس کے باوجود میں
اس کا نام کتاب میں اس قدر لگن سے تلاش کررہا ہوں۔

بات یوں ہوئی کہ بیمار پڑنے سے ایک دن پہلے میں نے ریحانہ کو دفتر سے ٹیلی فون
کیا: ''آخر ایسی بھی کیا ناراضگی ہے کہ آپ نے پلٹ کر ہماری خبر ہی نہ لی۔ ہر شام کلب
میں آپ کی راہ تکتے تکتے آنکھیں تھک گئیں مگر آپ نے تو گویا کلب نہ آنے کی قسم کھا
رکھی ہے۔'' ریحانہ کی آواز خوب شگفتہ تھی اور پرانی رنجش کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے،
کہنے لگی:

''شیخ صاحب ہفتے بھر کے لیے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ وہ واپس آجائیں تو کلب
آنا ہوگا۔'' میں نے کہا: ''یوں لگتا ہے جیسے آپ کو دیکھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ اگر آپ شیخ
صاحب کے بغیر کلب نہیں آسکتیں تو شام کہیں اور اکٹھے گزاری جاسکتی ہے...... اور ہاں!
ابھی اپنے احمقانہ رویے کے لیے مجھے معافی بھی تو مانگنا ہے۔''

اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''چھوڑیے، معافی وعافی آپ ان منزلوں
سے، بہت دور نکل چکے ہیں۔''

میں نے کہا: ''خیر! یہ معاملہ تو اب ملنے پر طے ہوگا۔ اچھا یہ بتائیے آج شام فلم نہ دیکھی
جائے۔''

''مگر وہ تو آپ کا شراب پینے کا وقت ہوتا۔ اس کا کیا بنے گا؟''

''ارے! اس بات کو چھوڑیں آپ۔ چھ بجے امپیریل سینما آجائیے۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''منتظر رہوں گا۔''

''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

جیب میں ٹکٹ ڈالے میں پونے چھ بجے امپیریل سینما کے سامنے گاڑی میں بیٹھا
ریحانہ کا انتظار کررہا تھا۔ فلم کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر، بجلی کی روشنی میں نہائے کھڑے
اپنی اپنی بساط کے مطابق ہنسنے اور رونے میں مصروف تھے۔ انسانوں کا ایک ٹھٹھ سینما کے
دروازے پر گویا رکا کھڑا اچھل رہا تھا۔ ممیاتے ہوئے فقیر، چیختے ہوئے خوانچے والے شور وغل
کا آرکسٹرا بجا رہے تھے۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہونے کے باوجود مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔
میرا ذہن اس ہست و بود کے پورے ہنگامے سے قطع تعلق کیے ہوئے تھا۔ میری نظریں ہر
آتی جاتی سواری میں مستعدی سے ریحانہ کو تلاش کررہی تھیں۔ وقت نہایت سست روی سے
گھسٹ رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو پانچ منٹ گزرے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ایک زمانہ بیت چکا

ہو، میرے منہ سے نکلا۔ 'ریحانہ بی بی بس اب آ بھی چکو۔ بہت ہو چکا انتظار۔' یہ فقرہ شاید ذہنی الجھن کو کم کرنے کے لیے میں نے کہا۔ میرے ذہن کے اندر اس وقت رنگا رنگ کی بڑی تند و تیز کرنٹ اور کراس کرنٹس نے ایک طوفان بپا کیا ہوا تھا۔

وہ شاید نہ آئے......وہ کہیں آ ہی نہ جائے......میری ماں......اے۔ بی شیخ......میرا دفتر......حمیدہ......کلب......شراب......میاں جی......میرا باپ یا بھائی، یا دونوں، کچھ بھی نہیں۔ چاروں طرف آسمان تک بلند ہوتی ہوئی لہریں میری سوچ سمجھ کی ہر نہج پر دیواریں بنی راستہ روکے کھڑی تھیں۔ میں اس اندھے بچے کی طرح تھا جس کی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور جاتے ہوئے وہ چھوٹی سی لاٹھی بھی ساتھ لے گئی ہو جس کی مدد سے وہ اپنا راستہ کھوج لیا کرتا تھا۔ میری کیفیت فقط انتظار کی صعوبت اٹھانے کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتی۔ شاید نہیں۔ میں گاؤں کی اس اجڑی حویلی میں حمیدہ کا انتظار کیا کرتا تھا اور آج شہر کے بھرے بازار میں ریحانہ کا انتظار کر رہا ہوں۔ فرق کہاں ہے؟ اس وقت بھی دل میں طوفان اٹھا کرتے تھے مگر ان کے پانیوں میں اس طرح سڑاند اور بُو نہیں ہوتی تھی۔ میں شاید کسی نئے جذبے کے احساس سے دوچار ہوں۔ کوئی نئی ڈائی مینشن یا نہج میرے اندر پیدا ہو رہی ہے یا کسی پرانی ڈائی مینشن یا نہج پر بوسیدگی کا ملبہ گر رہا ہے اور وہ بند ہو رہی ہے۔ آخر سوال ننگا ہو کر سامنے آ گیا۔

'کیا تم اپنے دوست کی بیوی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟'

'کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں کسی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ کسی ایسے ساتھی کے ساتھ فلم دیکھنا جس کے ساتھ بڑی معصومانہ قسم کی فلرٹیشن چل رہی ہو کوئی عیب نہیں۔ تم بلاوجہ اسے مہیب اور گھناؤنے گناہ کے روپ میں پیش کرنا چاہتے ہو۔ اس دنیا میں کوئی چیز گناہ نہیں۔ کچھ بھی جرم نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو تم میں اسے جائز اور درست تسلیم کرانے کی ہمت ہو یا اسے عیاری سے چھپا لینے کی اہلیت ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ قید خانے گناہ گاروں اور مجرموں سے نہیں بھرے جاتے بلکہ احمق اور کمزور انسانوں سے

پُر کیے جاتے ہیں۔ اس زمین کے باسی ہونے کے ناطے جنس تمہارا حق ہے جو آج تک تم حاصل نہیں کر سکے اور اب جبکہ تمہارا حق تمہیں ملنے والا ہے تو تم اپنے ذہن کی پیٹھ پر نہ جانے کہاں کہاں سے بھاری پتھر لا لا کر لاد رہے ہو کہ ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی اس کی پیٹھ کڑک کر کے ٹوٹ جائے۔ مسٹر اے۔ بی شیخ میرا دوست نہیں محض واقف ہے۔ اور ریحانہ اے۔ بی شیخ کی ملکیت نہیں محض بیوی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے صاف ستھرے ذوق کی مالک، اتنے بدصورت آدمی کو کبھی رضامندی سے اپنا شوہر منتخب نہ کرتی۔ آخر وہ ایک آزاد ملک کی ایک آزاد شہری ہے۔ اسے اگر اپنی زندگی کا ساتھ منتخب کرنے کی اجازت نہ تھی تو کم از کم اب اسے اپنی پسند کا جنسی ساتھی منتخب کرنے کی اجازت تو ہونی چاہیے۔ تمہاری ماں نے بوڑھے سے بیاہے جانے پر اپنی پسند کا جوان ساتھی منتخب کر ہی لیا تھا نا'

میں خیالات کی یلغار سے گھبرا کر کار سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی پر چھ بج رہے تھے۔ سینما کے سامنے سے بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ ریحانہ کا ڈرائیور اسے سینما کے سامنے کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کار سے اتر کر اندر چلی جا رہی تھی کہ میں تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھا۔ میرے ذہن نے تمام خیالات کو فوراً اس طرح جھٹک دیا جیسے کتا جوہڑ سے نکل کر ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے پانی اپنے بدن سے جھٹک دیتا ہے۔

"ہیلو!" میں نے کہا۔

"اوہ ہیلو! آپ ابھی ابھی آ رہے ہیں؟"

"نہیں جی۔ میں تو پونے چھ بجے سے یہاں کھڑا سوکھ رہا ہوں۔"

"اوہو! سوری۔ مگر آپ کہاں چھپے ہوئے تھے؟"

"باہر کار میں بیٹھا آپ کی راہ تک رہا تھا۔ اب آپ کو اندر جاتے دیکھا......"

"فلم ابھی شروع تو نہیں ہوئی؟"

"شاید نہیں۔ لیکن کیا فلم دیکھنا ضروری ہے؟"

یہ سن کر سیڑھیوں کی جانب اس کا بڑھا ہوا قدم رک گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں

آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا: ''کیا مطلب؟''

اس کے چہرے، ہونٹوں اور بالخصوص آنکھوں سے دبانے کے باوجود ایک ایسی مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی جیسی اس ماں کے چہرے سے پھوٹ رہی ہوتی ہے جس نے اپنے بیٹے کی کسی شرارت کا منصوبہ عمل میں آنے سے پہلے بھانپ لیا ہو۔

''مطلب کچھ نہیں، بات صرف یہ ہے کہ کہیں گھومتے پھرتے ہیں۔ باتیں کریں گے، فلمیں تو آپ روز دیکھتی ہی رہتی ہیں۔''

''میرا ڈرائیور جو یہاں آئے گا، مجھے لینے کے لیے......''

''میں اگر اس کے پہنچنے سے پہلے آپ کو یہاں پہنچا دوں تو کیسا رہے؟''

''خوب رہے۔''

میں بے حد خوش تھا کہ پہلی بار ایک ایسی عورت میرے برابر کار کی سیٹ پر بیٹھی ہے جس نے کم از کم اس وقت کے لیے اپنی زندگی کی باگ ڈور کلی طور پر مجھے تھما دی تھی۔ میں مطمئن تھا، پر امن تھا، آشتی پر تھا، اپنے آپ سے اور تمام دنیا سے۔ میری روح نے پہلی بار اپنے اور تمام کائنات کے درمیان ایک ایکویشن کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ میں اس نالے کی طرح تھا جو دریا سے کٹ کر جلتے ہوئے صحراؤں اور تپتے ہوئے ویرانوں میں بھٹکتا ہوا پھر آ کر دریا سے مل گیا ہو۔ گاڑی ذرا کھلی سڑک پر آئی تو میں نے اپنے کیف و سرور کے بند گنبد میں سے منہ نکال کر بات کا سلسلہ شروع کیا۔ مجھے اپنی آواز اس قدر ٹھوس اور حقیقت سے پُر محسوس ہوئی جس طرح مٹی کے گھڑے کو اپنے اوپر برسنے والا پتھر محسوس ہوتا ہوگا۔

''میں نے اس رات آپ کو محض اپنے گنوار پن سے ناراض کر دیا۔''

''نہیں غلطی میری تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ نشے میں اس قدر دھت ہیں، بلاوجہ بچوں کی طرح ضد کر گئی۔ چلیے اب چھوڑیے اس بات کو۔''

''اجڈ، دیہاتی ہوں نا۔ اس لیے مہذب خواتین سے ملنے کے آداب سے بخوبی

واقف نہیں ہوں۔''

''ظفر صاحب! بس اب زیادہ نہ بنیے۔ مجھے سب پتہ ہے۔ ابھی بھی نہ جانے کتنی مہذب خواتین سے دوستیاں چل رہی ہوں گی۔''

جلاپے میں بجھی ہوئی اس کی یہ بات مجھے بہت پیاری لگی، جیسے کسی نے میری ڈھیتی ہوئی انا کے نیچے ستون دے کر اسے گرنے سے بچا لیا ہو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سیٹ پر دھرا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے ذرا سا کھینچا اور وہ پہلو میں مجھ سے لپٹ کر بیٹھ گئی اور سر میرے کندھے پر دھر دیا۔ ملی جلی خوشبوؤں کی ایک خوشگوار مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔

''نہیں ریحانہ تم غلط سمجھی ہو۔ یقین کرو تم میری زندگی میں پہلی عورت ہو۔ میں نے تمہارے سوا آج تک کسی سے پیار نہیں کیا۔'' یہ جھوٹ بولتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ایک مرتبہ حمیدہ کا چہرہ گھوم گیا۔ سرسوں کے تیل کی تیز بو کا بھبکا سا کار میں گھوم گیا۔ میں نے جھٹ اس کے چہرے کو اپنے ذہن کے کسی اندھیرے غار میں دھکیل دیا اور غار کے منہ پر ماضی کا پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا۔ تاکہ اس کے خیال کا سایہ بھی ریحانہ پر نہ پڑ سکے۔

اس نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا: ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہم جا کہیں نہیں رہے لیکن بھاگ ضرور رہے ہیں...... بگٹٹ۔ کسی رسہ تڑا کر بھاگنے والے گھوڑے کی طرح، جدھر منہ اٹھ جائے، جدھر راستہ مل جائے۔''

اس نے الگ ہٹ کر میرے چہرے پر بڑی گہری ٹٹولنے والی نظریں ڈالیں، میرے اس اندر کو پڑھنے کی کوشش میں جس سے یہ جواب ابھرا تھا۔ میرے بظاہر پرسکون چہرے کو میرے اندر کا مظہر سمجھتے ہوئے اس کے دل میں ابھرتے ہوئے شکوک غالباً رفع ہو گئے۔ وہ مطمئن ہو کر پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔ گاڑی کسی آزاد جانور کی طرح اپنی منشاء سے گھومتی پھرتی گلیوں اور سڑکوں کے چکر لگاتی۔ کبھی تیز کبھی آہستہ دوڑتی، سمندر کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے جفتی کی لذت سے کراہتا ہوا سیاہ سمندر اور اسی لذت

میں ڈوبی ہوئی مدہوش کالی رات باہم دگر لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ آسمان اپنی لاکھوں چمکدار آنکھیں پوری شدت سے پھاڑے حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ کاش اگر میں اپنی بلندیوں سے پیچھا چھڑا سکتا تو میرا محبوب آج مجھ سے یوں مایوس ہو کر رقیب سے تسکین کا جویانہ ہوتا۔ میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا کہ دور بہت دور فاصلے پر جا کر آسمان، مدہوش رات اور کیف وسرور میں ڈوبا ہوا سمندر ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک ہو گئے تھے۔ فاصلے یہی عمل کرتے ہیں۔ مقاماتی فاصلے تو بہت چھوٹے پیمانے پر یہ عمل کرتے ہیں۔ لیکن وقت کے فاصلے تو ہجر ووصال، زندگی اور موت کے علاوہ ماضی اور مستقبل کو بھی اپنی چکی میں پیس کر ایک کر دیتے ہیں۔ فاصلے انفرادیت کے دشمن ہیں اور ملغوبہ تیار کرنے کے شوقین۔ فاصلوں کی کٹھالی میں کچھ نہیں بچتا۔ سب کچھ پگھل کر ایک ہو جاتا ہے......ایک ہو جاتا ہے...... میرے کانوں میں پاگل کر دینے والی گونج کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ ای ک ہ و ج ات اہ ے۔ رات...... سمندر...... آسمان۔

پاؤں تلے کھسکتی ریت پر ہم آہستہ آہستہ چلتے سمندر کی جانب بڑھے جا رہے تھے۔ ریحانہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر پوچھا: ''ظفر صاحب! آپ کن خیالوں میں گم ہیں؟''

''تمہارے خیالوں میں۔''

ایک ننھی سی ہنسی ہنستے ہوئے اس نے کہا: ''جب میں خود آپ کے پاس ہوں تو میرے خیالوں میں گم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے بازو اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ پانی کی لہر ہمارے پاؤں کو بھگوتی ہوئی لوٹ گئی۔ میں نے کہا: ''آؤ سمندر سے ہاتھ تو ملا لیں۔'' ہم دونوں نے ایک ایک چلو پانی کا بھر کے ہوا میں اچھال دیا۔

''ریحانہ! دیکھو سمندر کا کتنا بڑا پیٹ ہے اور پانی سے پُر ہے لیکن بے چارے کے لب پھر بھی سدا خشک ہی رہتے ہیں۔''

اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: ''بالکل آپ کی طرح۔'' اور پھر

کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ اور اس کی اس ادا پر میرے اندر اس کے لیے چاہت کا ایک چشمہ سا ابل پڑا۔ اور میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے اور ہم گم ہو گئے۔ میرے خون کے اندر چھپا ہوا وہ وحشی جذبہ، افزائشِ نسل جس کی ذمہ داری ہے، عرصے کے بعد نیند سے جاگ کر انگڑائی لینے لگا۔ بچپن میں ایک مرتبہ میں گھونسلے سے گرا ہوا گوشت کا لوتھڑا سا چڑی کا بوٹ ہاتھ میں لیے تمام گھر میں پھرتا رہا تھا اور کسی کے کہے سے اسے چھوڑتا نہیں تھا۔ اس کی گرمی اور دھڑکن آج تک میری ہتھیلی میں سمائی ہوئی ہے۔ نسوانی بدن کے بھرپور لمس سے اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن کے ہر ہر عصب کی ہتھیلی پر چڑی کا ننگ دھڑنگ بوٹ بیٹھا دھڑک رہا ہو۔ میں نے کہا: ''ریحانہ! تمہاری توجہ سے میرے خشک ہونٹ تو تر ہو گئے ہیں، جب سمندر کی قسمت ہو گا تو کوئی اس کے ہونٹ بھی تر کر دے گا۔'' وہ خاموش رہی۔ اس کا سر میرے سینے پر تھا اور ہاتھ میری گردن سے کھیل رہا تھا۔ دور سے کار کی تیز روشنی کی دھار ہم پر پڑی۔ ہم الگ ہو گئے۔ ریحانہ نے کہا: ''چلیے! کار کے پاس ریت پر بیٹھتے ہیں۔''

''چلو۔''

''مجھے تو وقت کا کوئی احساس نہیں رہا، کیا بجا ہو گا؟''

''یہی کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔''

''پھر تو بہت وقت ہو گیا۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ نو بجے تو فلم ختم ہوتی ہے۔''

''ریحانہ سنو! میری ایک تجویز ہے۔ میرے گھر چلو اور وہاں سے ٹیلیفون کر دو کہ ڈرائیور کو سینما جانے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ تم اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ہو اور کھانا وانا کھا کر دس بجے تک گھر پہنچ جاؤ گی۔''

''ہوں ہوں...... اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ ایسے ہی کیے لیتے ہیں۔''

گاڑی خوب تیز بھاگی جا رہی تھی۔ ریحانہ پوچھنے لگی:

''مجھے یہ بتائیے کہ ہم سمندر پر کیا لینے آئے تھے؟ ہمیں شروع میں ہی آپ کے گھر

جانا چاہیے تھا۔ وہاں پر سوائے نوکروں کے اور کوئی تو ہوتا نہیں۔''

''میں کوئی پلان بنا کر تھوڑی وہاں گیا تھا۔ مجھے بھی تو تبھی پتہ چلا جب گاڑی سمندر کے کنارے پہنچ گئی۔ میں شاید اپنے دوست سمندر کو دکھانے گیا تھا کہ وہ شخص جو نشہ میں دھت راتوں کو دو دو بجے تیرے کنارے بیٹھ کر تنہائی کو بہلایا کرتا تھا اب تنہا نہیں رہا۔ اسے ایک ساتھی مل گیا ہے اور اس نے تنہائی کے خلاء کو پُر کر لیا ہے۔''

''ارے میں تو سمجھتی تھی کہ آپ بڑے کائیاں بزنس میں ہیں لیکن آپ تو بیچ میں سے شاعر نکلے۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ اگرچہ میں نے بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن دل میں اس لیے سہم گیا کہ اسے کہیں دوسروں کے اندر جھانک کر دیکھ لینے کا ملکہ تو نہیں۔ کہیں اس طرح وہ میرے اندر چھپا کے رکھے ہوئے راز کو نہ پا جائے۔ پھر سوچا اس میں ہراساں ہونے کی کونسی ایسی بات ہے۔ اس نے یونہی ایک معصوم سا فقرہ کہا ہے اور بس۔ اوّل تو میں شاعر ہوں نہیں اور خیر اگر ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔

''کیوں، ٹھیک کہا نا میں نے؟'' وہ بولی۔

میں نے جواباً اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

گھر پہنچ کر میں اوپر اسے بیڈ روم میں لے گیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے گھر ٹیلیفون کر کے اطمینان کا سانس لیا اور پھر مٹکتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کے سانولے گوشت میں کمر کے گرد سلیٹی ساڑھی پھنسی جا رہی تھی۔ بلاؤز میں ڈھنپے کندھوں کے نیچے سے شروع ہونے والی ایک واضح لکیر جو نیچے آ کر ساڑھی میں گم ہو جاتی تھی۔ بتا رہی تھی کہ کہیں اندر دور ریڑھ کی ہڈی بھی ہے۔ میں اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس پوری عورت کو تیزی سے پیتا جا رہا تھا۔ اس نے لپ اسٹک نکال کر ہونٹوں پر جگہ جگہ لگانا شروع کر دی۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''کس پروف بھی آخر اتنی کس پروف نہیں ہوتی۔'' اس نے گردن موڑ کر کاجل میں ڈوبی ہوئی موٹی سیاہ آنکھوں سے سر سے پاؤں تک میرا

جائزہ لیا۔

''اونہہ سب کچھ جانتے ہیں اور اتنے بھولے بن کر دکھاتے ہیں۔'' پھر اونچی ایڑی کا جوتا اتار کر قالین پر پاؤں رگڑ رگڑ کر ریت اتارنے لگی۔ مجھے ایک دھچکے سے محسوس ہوا کہ جوتا اتارنے سے وہ یکدم کتنی چھوٹی ہو گئی ہے۔ تو لوگ محض زبان سے ہی نہیں جوتوں سے بھی اپنے حق میں جھوٹ بلوانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ فقرہ اس نے جس دلفریب نخرے سے ادا کیا تھا، اس کی سرشاری کو برقرار رکھتے ہوئے جا کر میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور پلنگ پر لے آیا۔ اٹھانے کو تو میں اسے اٹھا کر پلنگ پر لے آیا اور اسے پوری شدت اور گرمی سے چومتا جا رہا تھا لیکن برابر یہ سوچ بھی جا رہا تھا کہ یہ کون ہے؟ یہ سانولا سلونا اجنبی بدن جسے میرے ہاتھ لحظہ بہ لحظہ کپڑوں کی قید سے آزاد ہونے میں مدد دیتے جا رہے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹا پڑا کیوں ہانپ رہا ہے؟ یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ ہاں! یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ حمیدہ کے ساتھ والی رات کی طرح اگر...... بے اعتمادی، پانی میں ڈوبتے ہوئے سکے کی طرح، میرے رگ و رپے میں اترتی جا رہی تھی۔ ریحانہ مجھ سے چمٹی ہوئی تھی جیسے میں کوئی سمندر میں بہتا ہوا تختہ ہوں اور وہ تباہ شدہ جہاز کی مسافر۔ میں نے سوچا کہ میں اپنا تشخص نہیں کھو سکتا۔ میں اس میں جذب نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی انفرادیت نہیں کھو سکتا۔ یہ مجھ پر وہی عمل کرے گی جو رات، سمندر اور آسمان پر فاصلے نے کیا تھا۔ جیٹھ، ہاڑ کی لوؤں کی طرح ریحانہ کی جلتی ہوئی سانسیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں چیخا کہ 'تمام انسانوں میں بٹ کر جو میرے حصے میں وحشی آیا ہے وہ کہاں ہے؟' وہ ابھی تو سمندر کے کنارے میرے خون کے اندر انگڑائی لے کر جاگا تھا۔ 'اے! میرے حصے کے وحشی تو مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟ واپس آ جا۔' ریحانہ کا ہاتھ میرے برہنہ بدن پر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ وہ ننھا ہاتھ صحرا جتنے بڑے اور صحرا جیسے بنجر جسم کے ہر ہر ذرے پر ہمہ وقت موجود انہیں کرید رہا تھا۔ میرے خون کے اندر اب کچھ باقی نہ بچا تھا۔ زندگی کی دلیل صرف مایوسی تھی جو خون کے ہر خلیے کے پردے کے پیچھے سے مجھے اپنی اداس آنکھوں سے خاموشی تک

بیٹھی رہی تھی۔ ریحانہ کا ازل سے تشنہ بدن پانی کے انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے آخر چل
بسا اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت بوجھل آواز میں کہا: ''آپ پھر تھوڑی سی شراب
ہی پی کر دیکھ لیں۔''

میں یہ کہتے ہوئے پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نہیں بے کار ہے۔ مسجد کے گنبدوں کی
طرح کوشش کر کے اوپر اٹھتے بوجھل سانولے ابھاروں پر جامنی کلس دھرے تھے۔ سانولا
نرم پیٹ نیچے جا کر آہستگی سے کالے سیاہ ابھار میں شامل ہو رہا تھا۔ کتنی اچھی کلر سکیمیں
تھیں۔ بھاری سڈول رانیں نازک جلد میں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں ایک غریب بیوہ کا اکلوتا بیٹا
اور سامنے کھلونوں سے بھری دوکان۔ ریحانہ نے میری نظروں سے چھپنے کے لیے چادر کھینچ
کر اوپر لی اور پہلو بدل لیا۔ غیر محرم سے مکمل پردہ ہونا ہی چاہیے۔ میں باتھ روم سے کپڑے
پہن کر واپس آیا تو ریحانہ جوتے تک پہن کر کھڑی ہاتھ میں پرس جھلا رہی تھی: ''بہت دیر ہو
گئی۔ مجھے جلدی سے گھر پہنچا دیں۔''

میں نے خاموشی سے چابی اٹھائی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

دوڑتی ہوئی کار میں دو لاشیں برابر برابر سیٹوں پر بیٹھی چلی جا رہی تھیں۔ کار رکی: ''گڈ
نائٹ'' کی آواز آئی اور کھٹاک سے دروازہ بند ہو گیا۔ میرا ذہن پتھر بن چکا تھا۔ ان گھڑا،
بے ہنگم پتھر۔ دفعتاً میرے دانت کٹ کٹ بجنے لگے اور بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ گویا باری کا
بخار چڑھ رہا ہو۔ کلب کی روشن عمارت جگر جگر کرتی کاریں، دمکتے چہرے، رنگین ساڑھیاں،
خوشنما سوٹ۔ 'تو تم یہاں پہنچ گئے ہو؟' میرے ذہن نے پہلی بار مجھ سے بات کا سلسلہ
شروع کیا۔

'تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ یہاں تو جاندار قہقہے ابل رہے ہوں گے؟ ٹن ٹناتی ہنسیاں
بکھر رہی ہوں گی۔ گلاب کے پھولوں جیسی مسکراہٹیں چمک رہی ہوں گی۔ کون کون کس کس
کے لیے ہوگا۔ تم ان سب کو جاننے کے باوجود کسی کو نہیں جانتے۔ تم ان کے لیے اجنبی ہو، وہ
تمہارے لیے اجنبی ہیں۔ تم تنہا ہو، قطعی تنہا۔'

'اپنے دکھ کے ساتھ، اپنی کھال کے اندر۔'

'میں یہاں شراب پینے آیا ہوں۔'

'شراب تو تم گھر پر بھی پی سکتے تھے۔'

'وہاں کمرے کا فرنیچر زندہ ہو کر درندوں کی طرح مجھے چیر پھاڑ کر کھا جاتا۔ میں یہاں
صرف پناہ لینے کے لیے آیا ہوں، دوسرے انسانوں کے ساتھ ہونے کی خاموش پناہ۔'

میں کٹکٹاتے دانتوں کو زور سے بھینچ کر ان کے بجنے کو قدرے ضبط میں لے آیا اور
دونوں بازوؤں کو ہاتھوں سے پکڑ کر چھاتی کو کس لیا تا کہ کپکپاہٹ کم از کم دوسروں کو نظر نہ
آئے اور تیزی سے باہر کی طرف چل پڑا۔

''آب دار! دو ڈبل۔ جلدی۔''

اس نے وہسکی گلاس میں ڈال کر کاؤنٹر پر رکھی اور خود برف، سوڈا وغیرہ لینے کے
لیے مڑا تو میں دو ڈبل ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ واپس آ کر وہ مجھے ایسی مستعجب
نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جیکی یاد آ گیا۔

''آبدار! دو ڈبل اور......'' اب کے برف اور سوڈا کے ساتھ دوسرے گلاس میں آہستہ
آہستہ ایک دو گھونٹ پینے تک دانتوں کا کٹکٹانا اور بدن کی کپکپی غائب ہو گئے۔

''واہ! میری محبوب کیا کہنے تیرے۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں چاہا۔ اور ہمیشہ میرے دل
میں چبھے ہوئے کانٹوں کو ایک ایک کر کے چن لیا۔ اتنا ڈھیر سارا سکون اور کون مجھے دے سکتا
ہے۔ میری پہلی اور آخری محبوب۔''

میں نے گلاس فرطِ محبت سے بے اختیار ہو کر چوما۔ ذرا سا ہوا میں بلند کیا اور غٹا غٹ
پی گیا۔ کاؤنٹر سے گھوم کر دیکھا تو لوگ باتوں میں جتے ہوئے تھے۔ پوری توجہ اور انہماک
کے ساتھ۔ کمرے میں اتنا شور تھا جتنا گھنے جنگلوں میں شام کے ہنگام کا ہوتا ہے۔ انہیں
اس دھماکے کی کوئی خبر نہیں جو اِس وقت میرے اندر ہو رہا ہے۔ مجھے بھی تو ان کے اندر
ہونے والے دھماکوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم سب ہی تنہا ہیں، ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک

ہے۔ بوتلوں کے پھاہے بنا بنا کر اپنے اندر پھیلے ہوئے زخموں پر چپکاتے جاؤ۔ بس یہی
علاج ہے۔

''آب دار! دوڈبل اور......''

اس نے حیرت سے میرے چہرے کو دیکھا اور کچھ بولنا چاہا مگر صرف ''صاحب'' کہہ
کر خاموش ہو گیا۔ یک دم مجھے احساس ہوا کہ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر ایک لحظہ اور
یہاں پر رکا تو میرا سانس بند ہو جائے گا۔ میں نے گلاس منہ سے لگایا اور ختم کر کے کاؤنٹر پر
رکھا اور چل پڑا۔ گیلری میں بیگم و رستم علی اور امجد ملے اور ان لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں
روکنے کی کوشش کی لیکن میں مصروفیت کا بہانہ کر کے نکل کھڑا ہوا۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہی پکارا: ''دینو، دینو۔ اس گھر میں لگی ہوئی ہر بتی روشن
کردو۔ کسی کونے کھدرے میں بھی اندھیرے کا کوئی دھبا موجود نہ رہنے پائے۔ آج سے
میں نے اندھیروں کو جلاوطن کر دیا ہے۔'' اگرچہ میرے ذہن کا ایک حصہ مجھے روک رہا تھا
کہ بلاوجہ اس طرح ڈرامائی انداز میں چیخ چیخ کر ایک لایعنی بات کہہ کر تم صرف خود گدھے
بن رہے ہو اور کچھ حاصل نہیں۔ لیکن میں مجبور تھا اور بازو ہوا میں لہرا لہرا کر چیخے جا رہا تھا:
''اندھیرے اب یہاں نہیں رہ سکتے صرف روشنیاں جگمگائیں گی۔'' دینو، خانساماں،
چوکیدار، مالی، ڈرائیور وغیرہ کمروں سے نکل نکل کر بھاگے آرہے تھے کہ اس آسیب زدہ
خاموشی کے عادی گھر میں آج دفعتاً اتنا شور کیوں مچ گیا ہے۔ کیا آفت نازل ہو گئی۔
میں کمرے میں پہنچ کر دیوانہ وار شراب کی الماری کی طرف جھپٹا اور وہسکی کی بوتل
کھول کر پانچ، چھ، سات گھونٹ حلق میں انڈیل گیا۔ جیکی پاؤں میں لوٹ رہا تھا۔ میں نے
کھینچ کر ایک لات جمائی۔ وہ چیاؤں چیاؤں کرتا کونے میں جا کر دبک گیا۔ ذہن میں جلتی
ہوئی چتا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے اندر اور وہسکی انڈیلی۔ سامنے آئینے میں، پسینے میں
شرابور ایک شخص کھڑا تھا۔ ڈھیلے اعضاء، جھکے کندھے، پھٹی آنکھیں، ماتھے پر پسینے سے چپکے
ہوئے بے قرار بال اور مردے کی طرح زرد چہرہ۔

'یہ کون اجنبی ہے؟ میں ہوں؟'
جیسے لاش کو کسی نے دریا سے نکال کر، سہارا دے کر آئینے کے اندر کھڑا کر دیا ہو۔
'یہ میں نہیں ہوں۔ میں یہ نہیں ہونا چاہتا۔'
'تم ہونا چاہتے ہو یا نہیں ہونا چاہتے لیکن حرامی ایسے ہی ہوتے ہیں، جن کی مائیں......'
شیشے کی ایش ٹرے اڑتی ہوئی آئینے سے جا کر ٹکرائی اور ایک چھناکے کے بعد سامنے
چمکتے دمکتے ماحول میں لپٹی ہوئی لاش کی بجائے صرف لکڑی کا ایک ملگجا قد آدم تختہ کھڑا تھا۔
گونگے کی طرح خاموش، حلالی اور حرامی کی ہر فکر سے آزاد، اپنے اندر کی گہری سوچوں میں
ڈوبا ہوا۔ اپنے عکس سے پیچھا چھڑانے کی خوشی میں بوتل کو ہوا میں بلند کر کے منہ سے لگا لیا
اور یوں شراب سے اپنے اندر کی آگ بجھانے کی مصروفیتوں میں سے ایک لحظہ چرا کر چند
گھونٹ بنام آزادی پی کر جشن منایا۔ کمرہ میرے پاؤں تلے ایک کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔
اندھیرے کے بڑے بڑے دھبے ہر جگہ تیرتے پھر رہے تھے اور دم بہ دم بڑھتے جا رہے
تھے۔ میں نے سوچا کہ پیشتر اس کے کہ تمام دھبے آپس میں مل کر میرے اردگرد اندھیرے کی
گہری چادر لپیٹ دیں کیوں نہ اور روشنی کا بندوبست کر لوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے
فرنیچر کو فرش پر مار مار کر توڑنا اور ایک جگہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں، البتہ دینو نے اس طرح بتایا تھا: ''جب آپ
کے کمرے سے توڑ پھوڑ کی ہولناک آوازیں ذرا ذرا وقفے سے برابر آنے لگیں تو گھبرا کے
سب نوکر اوپر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ نہ تو جواب دیتے تھے اور نہ ہی دروازہ کھولتے
تھے۔ آخر دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو ٹوٹے ہوئے فرنیچر کے ڈھیر پر آپ گرے
ہوئے تھے۔ چہرے پر خراشوں سے لہو رس رہا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔
ایک ہتھیلی میں خون میں لت پت ماچس دبائی ہوئی تھی۔ جیکی آپ کے قریب کھڑا تھا اور
خالی بوتل دیوار کے ساتھ لیٹی تھی۔ ہم فوراً کار میں ڈال کر آپ کو ہسپتال لے گئے۔''

وہ آنگن جس میں ہر وقت چار پائیاں ادھر ادھر بچھی رہتی تھیں، آج وہاں دیکھنے کو بھی کوئی چار پائی نہ تھی۔ کسی طرف چھاج میں گندم پھٹکی نہیں جا رہی تھی۔ خالی کھرے میں کوئی کپڑے نہیں دھو رہا تھا۔ نلکا ہینڈل نیچے ڈھلکائے گویا صدیوں سے خشک کھڑا تھا۔ اندھے سے چولہے پر کوئی بڑ بڑ پکتی ہنڈیا نہ تھی۔ کونے میں لگی مٹی کی بڑی سی انگیٹھی سے کوئی بل کھاتا ہوا دھواں نہیں اٹھ رہا تھا اور نہ اس میں دودھ کا برتن تھا نہ دودھ۔ بھرے پُرے آنگن کے وسط میں میری ماں، سوتیلی ماں، بھابیاں اور رضیہ خاموش قطار باندھے کھڑے تھے۔ وہ آج زمین کی تقسیم کے لیے، مکان کے قبضے کے لیے، پیداوار کے حصول کے لیے آپس میں لڑ کیوں نہیں رہے تھے؟ ان کے وکیل اور عدالتیں کیا ہوئیں؟ رضیہ کی روتی ہوئی آنکھیں کہاں گئیں؟ اور بھابیوں کے ہوا میں لہرا لہرا کر کوسنے دینے والے بازو کیا ہوئے؟ سوتیلی ماں کی چھوٹے چھوٹے قدم لیتی ہوئی بوڑھی ٹانگیں جو ہر کسی کو صبر کا پیغام دینے جاتی تھیں، آج حرکت میں کیوں نہ تھیں؟ میری ماں کا گالیاں اگلنے والا آتش فشاں دہانہ خاموش کیوں تھا؟ بھائیوں کی شعلہ فشاں آنکھیں اور غصے سے سرخ بھرے ہوئے چہرے...... مگر ان میں سے کسی کا چہرہ تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو صرف کیچڑ کے وہ تودے ہیں جنہیں کھڑا کر کے ہم ٹھیکریاں ٹھونس ٹھونس کے ان کے چہروں کے بے ڈھبے نقوش بنا دیا کرتے تھے۔ یہ تو دسہرہ میدان

میں کھڑے راون اور اس کے بھائیوں کے بتوں کی طرح ہیں۔ انہیں ابھی آگ دکھا دی جائے گی اور یہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے چند منٹوں کے اندر راکھ کے ڈھیر بن کر زمین پر پڑے ہوں گے۔ 'ارے! میں تو ننگا ہوں، بالکل ننگا ہوں۔' ستر پوشی کے لیے ادھر ادھر کچھ بھی نہیں۔ اتنے میں دو بوڑھی عورتیں صحن میں کہیں سے آ دھمکیں۔ ان کے بال برف کی طرح سفید تھے اور منہ دانتوں سے یکسر خالی۔ ان کے چہروں پر گہری گہری جھریوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ اپنے گھناؤنے، بھیانک اندھیرا اُگلتے ہوئے منہ کھول کھول کر وہ لپک لپک کر اپنے ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں سے میرے ننگے بدن کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خوف سے میرا سانس گھٹنے لگا۔ رواں رواں کانپ اٹھا۔ میں نے مدد کے لیے اپنے رشتہ داروں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ کیچڑ کے تودے اسی طرح کھڑے رہے۔ دھرتی میں مضبوطی سے پاؤں گاڑے، حرکت سے معذور اور تاثر سے عاری۔ مایوس ہو کر میں بھاگ نکلا۔ گلی میں شیر علی کی ڈھیتی ہوئی حویلی کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اس کا زنگ آلود قفل کسی نے کھولا ہوگا؟ میاں جی تیزی سے حویلی کے دروازے سے نکل کر مجھے آوازیں دے رہے تھے۔

''واپس آ جا شفیع! واپس آ جا۔''

میں نے اڑے جاتے گھوم کر دیکھا، وہ گلی کے درمیان مایوسی کے عالم میں بازو پھیلائے کھڑے تھے اور ان کا بڑے سے پگڑ والا سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی پلاسٹک کی گڑیا ہوں۔ وہ پچھل پائیاں تیزی سے میرا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھیں۔ 'یہ کون ہیں؟ میں انہیں جانتا ہوں۔ اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ مگر یاد نہیں آ رہا کہ کون ہیں۔ یہ ذرا جھریوں کا پردہ ہٹائیں تو فوراً پہچان لوں۔' اب ان کے پیچھے اسی طرح کی بوڑھیوں کا ہجوم چلا آ رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ کس طرح ہوا لیکن میں پیپل کے درخت کی بلند ترین شاخ پر بیٹھا تھا اور نیچے اپنا بڑا سا سیاہ منہ کھولے کنواں جما ہوا تھا جس کی تہہ میں سیاہی چمک سی مارتی تھی۔ یہ شاخ اگر ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟ شاخ واقعی ٹوٹ گئی اور میں اندھے کنوئیں میں گرتا چلا

جا رہا تھا۔ جس کا ڈر تھا آخر وہی ہوا۔ گہرائیاں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ خدایا! وہ سیاہی جو چمک مارتی تھی، کہاں گئی؟ اب تک آ کیوں نہیں چکتی۔ آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور اپنے بستر پر پڑا کانپ رہا تھا۔ ذہن میں خوف کا سانپ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ چھ مہینے کے بعد دفعتاً آج پھر خوفناک خوابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟ میں کاروبار کو پھر سے اپنی گرفت میں لے آیا تھا۔ بگڑتی ہوئی ساکھ سنبھل گئی تھی۔ بیرونی ممالک میں نئے گاہک پیدا ہو گئے تھے جو اب پھر پہلے کی طرح میری بے توجہی سے بد دل ہو کر آہستہ آہستہ مجھے چھوڑ جائیں گے۔ گاہک نہیں ہوں گے تو اپنا مال میری معرفت کون بیچے گا؟ کمیشن کہاں سے آئے گا؟ کمیشن نہیں ہو گا تو میں اپنی ذاتی کپاس کہاں سے خرید سکوں گا؟ بنک قرض دینے کے لیے کیونکر مجھ پر اعتبار کریں گے۔ میری لاکھوں کی آمدن، میری کاریں، میرے بنگلے، میرے ٹھاٹھ باٹھ، سب ختم ہو جائیں گے۔ سرکاری عہدے دار اور امیر لوگ جن سے میری دوستیاں ہیں، کنارہ کش ہو جائیں گے۔ اے میرے ذہن مجھے چھوڑ دے، میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا۔ کیا تُو چاہتا ہے کہ میں ایک کنگلے کی طرح اس شہر کی گلیوں میں بھیک مانگوں؟ اور آخر میں کسی خیراتی ہسپتال میں جا کر دم توڑ دوں۔ میری لاوارث لاش کو تو کوئی فیروز آباد لے جانے والا بھی نہ ہو گا۔

'لاش کو مجھے فیروز آباد پہنچوا کر کیا لینا ہے؟'

غیر ارادی طور پر جا کر شراب کی الماری کھولی کہ شاید کوئی بوتل پڑی ہو۔ مگر بوتل کہاں سے ہوتی، وہ تو ہسپتال سے واپس آتے ہی موت کے ڈر سے سب تقسیم کر دی تھیں۔ اب تو چھ مہینے ہونے کو آئے ہیں، ایک قطرہ تک چکھ کے نہیں دیکھا۔ میں بھی کتنا بزدل ہوں کہ موت کے خوف سے اسے لٹا دیا جو میری لاش کو ہر روز زندگی کرنے کے لیے چند گھنٹے عطا کر دیا کرتی تھی۔ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے پرومیتھیس کبھی بیوقوفی کرتے ہوئے رات ہی کو پارچہ پارچہ کر کے تقسیم کر دیتا، جس کی بدولت اس کا دن میں عقاب کا نوچ نوچ کر کھایا ہوا جگر صبح ہونے تک بحال ہو جاتا تھا۔

میرے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی اور میں ہانپ رہا تھا۔ بالکل دیوانے کتے کی طرح۔ سڑکوں پر کار دوڑ رہی تھی۔ بے تحاشا، شراب کی تلاش میں...... خود فراموشی کے ایک عارضی وسیلے کی تلاش میں۔

'اے شراب! تو کتنی کچی، ناقص اور ناپائیدار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تُو میری کتنی بڑی ضرورت ہے۔ آج تیرے بغیر میرا اندر الٹ کے یوں باہر آ جائے گا...... جیسے کوئی قمیص کو الٹا کر دیتا ہے۔' شراب کی ہر دکان پر ایک موٹا سا تالا ایک مدھم سے بلب کی روشنی کے نیچے مردہ پڑا ہوتا اور مجھے دیکھ کر جھٹ سے زندہ ہو کر میرا منہ چڑانے لگتا۔ آخر کار کلب کا رخ کیا۔ کلب کے احاطہ میں داخل ہوا تو سیڑھیوں پر بیٹھا اونگھتا ہوا چوکیدار میری کار کی بتیاں اپنی طرف بڑھتی ہوئی دیکھ کر مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''چوکیدار! شراب چاہیے۔''

''صاحب کلب تو بارہ بجے بند ہو گیا، اس وقت تو کوئی دو بجنے والا ہے۔''

''وہ مجھے معلوم ہے۔ دیکھو چوکیدار، پانچ سو، ہزار جتنا روپیہ چاہو لے لو، مجھے ایک بوتل دے دو، صرف ایک بوتل۔ ان بولتے ہونٹوں پر نہ جاؤ، اندر دور کہیں میری روح دم توڑ رہی ہے۔ میں اس کی آخری ہچکی لینے سے پہلے شراب کے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکانا چاہتا ہوں۔ شاید بچ جائے۔''

''میرا بات سنو صاحب۔ سیکرٹری بار کو تالا لگا کر چابی جیب میں ڈال کر گھر چلا گیا۔ بولو اب اِم کیا کرے؟ تالہ تو نہیں توڑ سکتا؟ وہ نوکری سے نکال دے گا، اُم کو قید کرا دے گا۔ اَمارا چھوٹا بچہ لوگ بھوک سے مر جائے گا۔''

''چوکیدار تم نہیں سمجھتے۔ وہ مر گئی تو میں خالی خولی ڈھانچے کو اٹھا کے جب دنیا والوں کے سامنے آؤں گا تو ایک تماشہ بن کے رہ جاؤں گا۔ مجھے جگ ہنسائی سے بچالو۔''

''خدا کا واسطے صاحب! اُم کو معاف کر دو۔ جو کچھ آپ بولتا ہے، اَمارا سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے، ہم تالہ نہیں توڑے گا بس۔''

مایوس ہو کر گاڑی واپس کی۔

میرا ذہن کرب کے پہاڑ تلے دب کر ماؤف ہوا چاہتا ہے اور محض چند قدم کے فاصلے پر اس کا علاج گیلنوں کے حساب تالے کے اندر پڑا ہے اور یہ کہتا ہے کہ 'اُم تالا نہیں توڑے گا بس۔' پھولے ہوئے پیٹ بھوک کی آگ میں جل جل کر اور پھولتے جا رہے ہیں اور گودام اناج سے بھرے پڑے ہیں مگر...... 'اُم تالا نہیں توڑے گا بس۔' پھیلی ہوئی ہتھیلیوں نے شہر کی سڑکوں پر چھاؤں کر رکھی ہے اور روپیہ تجوریوں میں بند ہے۔ مگر 'اُم تالا نہیں توڑے گا بس۔' شیر علی کی حویلی ڈھیتے ڈھے گئی مگر اس کی روح کہتی ہے ڈیوڑھی کا تالا اُم نہیں توڑے گا بس۔ شہوانی جذبات کے دباؤ تلے میرا اندر ایک دن بھک سے اُڑ جائے گا مگر میرا ذہن کہتا ہے کہ جنسی اختلاط کا تالا اُم نہیں توڑے گا، بس۔ یہ تالا کیا چیز ہے آخر؟ یہ کسی سے کیوں نہیں ٹوٹتا؟ ٹوٹے گا۔ کبھی تو ٹوٹ کر رہے گا۔

نہ معلوم کب، کیسے اور کیوں میری گاڑی ریحانہ کے مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اجاڑ سنسان سڑک پر دور دور بجلی کے کھمبوں پر ٹکے بلب جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے اور میں کار میں انجن بند کیے، ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے عدم تعاون پر تلے ہوئے ذہن کی ایک بہت دور چھپی پڑی چھوٹی سی معاون قاش کے سہارے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں آخر یہاں کیا لینے آیا ہوں؟ گیٹ کے دونوں طرف بجلی سے روشن دودھیا شیشوں پر اردو اور انگریزی میں اے۔ بی شیخ لکھا تھا۔ لوہے کے گیٹ کے دونوں پٹ مضبوطی سے بند تھے اور پیچھے ہٹ کر تاریکی میں ڈوبا ہوا، صدیوں سے بے جان، بے روح گھر، دوسرے ایسے ہی گھروں کی صف میں اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے مکانوں کی لاشیں پریڈ میں کھڑی ہوں۔ ابھی کاشن بلند ہوگا: ''مردہ پریڈ ڈِس مس'' اور تمام مکان بغیر کسی آواز کے فوراً سطح زمین کے برابر ہو جائیں گے۔ پورا ماحول جو کبھی زندگی سے دھڑک رہا ہوگا، کسی رشی کے شراپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے جان پتھر بن گیا ہے۔ ان گھروں کے اندر اب کوئی زندہ نہیں۔ سب پتھر بن چکے ہیں۔ اب یہ مکان اور مکین کبھی زندہ نہ ہوں گے اور اس رات کی کبھی صبح نہ ہوگی۔ وقت ان کے لیے تھم چکا ہے اور کائنات کی گردش ان کے لیے رک گئی ہے۔ اے۔ بی شیخ کا بجھی راکھ جیسا چہرہ تو زندگی میں بھی پتھر ہی کا نظر آتا تھا مگر اس نازک جلد والی کی سڈول رانیں پتھر بن کر کیسی نظر آتی ہوں گی؟ ان کی جاذبیت اور گداز میں کوئی فرق آیا ہوگا یا نہیں۔

میں یہ سوچ کر کار سے اترا کہ ابھی لوہے کے پھاٹک کو گھونسوں سے ڈم ڈم کھٹکھٹاتا ہوں۔ جونہی پھاٹک کھلے گا تو سیدھا مکان کے اندر گھس جاؤں گا اور ریحانہ جہاں کہیں بھی پڑی سو رہی ہوگی اس کو پلنگ سے اٹھا کر کندھے پر ڈال کر باہر لے آؤں گا۔ اگر اے۔ بی شیخ نے میرا راستہ روکا تو اسے گولی سے اڑا دوں گا۔ اور اگر ریحانہ نے لیت و لعل کی تو دو تھپڑ مار کر راہِ راست پر لے آؤں گا اور پھر اسے کار میں بہا لے جاؤں گا۔ اخباروں کی سرخی ہوگی کہ تاجر ایک کمپنی کے عہدیدار کی بیوی کو لے اڑا۔ ذیلی سرخی ہوگی کہ ملزم مجمع کو کار سے چیرتا ہوا واویلا مچاتی عورت کو بھگا لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ریحانہ تھوڑی دیر ڈس ڈس روئے گی، گالیاں دے گی اور پھر آہستہ سے میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ جائے گی۔ ہم دور کسی دیس نکل جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ نئے ملک میں آباد ہونے میں بڑی قباحتیں ہوں گی لیکن ریحانہ میری بیوی ہوگی۔ کدکڑے لگاتے ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے، آہا! کتنا لطف آئے گا۔ میں نے آہنی پھاٹک پر شر شر پیشاب کیا اور آ کر گاڑی سٹارٹ کی اور غراتی ہوئی کار کو پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے بڑی سڑک پر آ گیا۔ اب دونوں طرف بلند و بالا عمارتیں دوڑتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ عمارتیں بھی مجھے دفعتاً ایسے بے جان ڈھانچے نظر آنے لگے جو ابھی میری آنکھوں کے سامنے جھڑتے جھڑتے بالکل بکھر جائیں گے اور ان کے مکین اپنے اپنے کفنوں میں پارسلوں کی طرح بندھے اٹھ کے باہر سڑک پر آ کر میری گاڑی روک لیں گے اور مجھے باہر نکال کر سفید کفن میں لپیٹ کر ہجوم میں موجود باقی پارسلوں کی طرح کا ایک پارسل بنا دیں گے۔

سب پارسل ایک جیسے ہیں۔ کسی کی کوئی پہچان ممکن نہیں۔ پارسل کھول بھی لو تو کوئی

فرق نہیں پڑتا۔ وہی کھوپڑی، وہی آنکھوں کی جگہ دو کھوڑیں، وہی ننگے جبڑوں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا خاموش ہنسی کا طوفان۔

میں اس طرح کے بے نام، بے چہرہ ہجوم میں مل کر خود بے نام، بے چہرہ ہو جاؤں گا۔

میں نے شدت سے چاہا کہ اپنے آپ کو اپنا نام لے کر مخاطب کر کے کہوں کہ اس بھوتوں کی بستی سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ۔ مگر مجھے اپنا نام بھول گیا تھا۔ میں چیخا، تمہارا نام جو کچھ بھی ہے اور تم جو کوئی بھی ہو، گاڑی کو اور تیزی سے دوڑاؤ۔

دُور سامنے سڑک کے کنارے، فٹ پاتھ پر گیس کا لیمپ روشن نظر آیا۔ اور آگے گیا تو اس کے اردگرد چند انسان زمین پر اکڑوں بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سمندر کے وسط میں ایک بہت ہی ننھا منا سا جزیرہ ہے۔ جس پر کچھ لوگ پناہ گزین ہیں اور میں کہیں سے طوفان کی مار کھاتا، بہتا ہوا آرہا ہوں اور یہ لوگ مجھے موت سے بچالیں گے۔ میں نے گاڑی جزیرے کے بالکل سامنے سڑک کے دوسرے کنارے آ کر روک دی۔ ایک طرف حمام میں چائے سُوسُو کر رہی تھی اور گیس کا لیمپ لکڑی کے کھوکھے پر دھرا تھا۔ اس کے آس پاس خالی گلاس، پیالیاں وغیرہ سجی ہوئی تھیں۔ چٹائیوں پر بیٹھے انہماک سے چائے پیتے لوگوں میں سے ایک آدھ نے گھوم کر رکی ہوئی کار پر سرسری نظر ڈالی اور پھر چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ تو کیا یہ ہیں وہ لوگ جو بھوتوں سے لڑنے کے لیے اندرونی قوت بخشیں گے۔ اور جن کی مجھ میں دلچسپی زیادہ سے زیادہ ایک سرسری نظر تک محدود ہے۔ میں دراصل تنہا نہیں رہ سکتا، جسمانی طور پر اکیلا شخص ممیا ممیا کر اپنے کان خود کھا جاتا ہے۔ روح تنہا ہو تو چاہے آپ انجمن ہی کیوں نہ ہوں، ذہن کے اندر ایک گونج سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ گونج کئی بار اپنے ذہن میں ابھرتی ہوئی سنی ہے۔ تنہائی اگر روح میں جڑیں خوب گہری کر لیتی ہوگی تو گونج غالباً بلند ہوتے ہوتے اس کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہوگی اور لوگ اسے پکڑ کر پاگل خانے پہنچا دیتے ہوں گے۔ اتنے میں ایک آدمی میری کھڑکی کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور

بولا: ''حضور کوئی مال وال چاہیے؟'' میں نے ایک مرتبہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت پُراعتماد نظر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا: ''کیسا مال؟''

''حضور رات بہت ہو گئی ہے، اچھا مال تو شاید نہ ہو لیکن جو کچھ ہے آپ ایک نظر دیکھ لیں۔ پسند آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ کل جہاں کہیں، ایک سے ایک بڑھیا دانہ لا کر پیش کر دوں۔''

میں نے نادانستہ ہاتھ بڑھا کر مخالف سمت کا دروازہ کھول دیا۔ اور وہ میرے برابر آ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''سیدھے چلے چلیے۔ زیادہ دور نہیں، یہی کوئی ایک میل ہوگا یہاں سے۔ اس کا گھر ہے بھی تقریباً سڑک کے اوپر ہی۔ چھوکری کو ساتھ لے جانا چاہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ ویسے وہیں ٹھہرنا چاہیں تو اطمینان سے صبح تک وہیں ٹھہر سکتے ہیں۔ ہر چیز کا انتظام نہایت معقول پائیں گے۔''

یہ میں آج رات کس راستے پر چل نکلا ہوں؟ میں ایک ایسا جہاز ہوں جو بالکل خالی ہو اور جس کا لنگر ٹوٹ کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ چکا ہو۔ ہوائیں جس وقت جس رخ اور جس رفتار سے چاہیں، اسے دھکیل کر لے جائیں اور وہ ان کے سامنے مجبور و بے بس ہچکولے کھاتا چلتا رہتا ہے۔ نہیں! یہ خیال غلط ہے۔ میں نے دراصل سوچا نہیں کہ چلو تنہائی کا یہ علاج بھی کر دیکھیں جیسے کوئی ناقابلِ علاج مریض دواؤں سے مایوس ہو کر ٹوٹکے آزمانے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ سوچا تھا کہ ناواقف عورت (جس سے پھر کبھی دوچار ہونے کا امکان نہیں) کے سامنے ناکامی اور مستقل شرمندگی کا خوف بھی اتنا شدید نہیں ہوگا اور ممکن ہے یوں میرا عدم تعاون پر مصر ذہن میرے جسم کے اشتراکِ عمل پر آمادہ ہو جائے۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''دتو! بات یہ ہے.....'' اس نے احتجاج کیا: ''حضور میرا نام دتو نہیں، عبداللہ ہے۔ لیکن لوگ محبت سے مجھے ڈلاڈلا بھی کہتے ہیں۔ ویسے میں دتو کو بھی جانتا ہوں اور جو مال اس کے پاس ہے وہ بھی میرا دیکھا بھالا ہے۔ اب میں اپنے منہ سے کیا کہوں، حضور خدمت کا موقع دیں گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا۔ میرے

پاس ایسی ایسی لڑکیاں ہیں کہ دتو کے باپ نے بھی کبھی خواب میں نہ دیکھی ہوں گی۔''

''اچھا بھئی عبداللہ! میری بات بھی تو سنو۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے تیز طرار عورتوں سے نفرت ہے۔ کوئی سیدھی سادھی غریب طبیعت کی عورت ہو تو وہاں چلے جاتے ہیں، نہیں تو کل سہی۔'' میرا خیال تھا کہ ایسی عورت شاید مباشرت کا خوف دُور کرنے میں زیادہ مدد و معاون ثابت ہو سکے۔

دُلا بولا: ''حضور آپ فکر نہ کریں، ہم آدمی پہچانتے ہیں۔ آپ کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ کو کیسی لڑکی پسند آئے گی۔ ایسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کے پاس لے جا رہا ہوں، بس یوں سمجھئے کہ اللہ میاں کی گائے ہے۔ منہ میں زبان تو ہے ہی نہیں اور آپ کی دعا سے ایسی ٹریننگ دی ہے کہ جس طرح آپ کہیں گے اسی طرح خدمت کرے گی اور کیا مجال ہے جو زبان سے اف تک بھی کہہ جائے۔''

ایک میل کی بجائے تقریباً چار میل تک اس سڑک پر سیدھے جانے کے بعد ہم ایک کچی سی گلی میں مڑ گئے۔ کوئی چار سو گز تک ہم دو رویہ، کچے، پستہ قد جھونپڑی نما مکانوں کے رنگ برنگے ٹین کے بند دروازوں کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے گندے پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں اور کچی نالیوں میں سے شڑاپ شڑاپ بولتی غلیظ کیچڑ کے چھینٹے اڑاتے، ڈولتے، ہچکولے کھاتے کوئی دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے کھلی سی جگہ پر آ نکلے۔

وہاں سب سے الگ تھلگ ایک چھوٹا سا بنگلہ نما نہایت پرانا اور بوسیدہ سا مکان کھڑا تھا۔ چار دیواری جگہ جگہ سے غائب تھی۔ جہاں کبھی گیٹ ہو گا وہاں سے ہم اندر چلے گئے۔ کار کی ظالمانہ حد تک تیز روشنی کے سامنے مکان بالکل بے بس ہو کر یوں ننگا کھڑا تھا جیسے اس نے سوچ لیا ہو کہ ستر پوشی کی اب کوئی بھی کوشش بالکل بے معنی ہو گی۔ اس لیے قانع ہو کر خاموشی سے جیسے بھی ہو، کھڑے رہو۔ سامنے دو کمروں کی دیواریں اس کے اندر گر کر اب محض پتھروں کا ڈھیر تھیں۔ اس سارے خرابے میں صرف ایک ہی چیز زندہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اس مکان کے بہت ہی مختصر، چھوٹے سے چٹیل لان کے ایک کونے میں پام کا سیاہ درخت تھا، جو

ہر چیز سے بے خبر، تیز چلتی ہوئی ہوا میں کھڑا وارفتگی کے عالم میں دیوانہ وار ناچ رہا تھا۔ شاید اپنے زندہ ہونے پر خوش تھا یا صرف زندگی کے کرب کو فراموش کرنے کے لیے ناچ کو ایک ذریعے کے طور پر اپنائے ہوئے تھا۔ دُلا جو اَب بلی کی طرح مسکین بنا میرے پہلو میں بیٹھا تھا، اب شیر کی طرح ان کے دروازے پر کھڑا دھاڑ رہا تھا۔

''پیٹر! میری! ممی! دروازہ کھولو۔''

دو تین منٹ تک اس کے بلاتوقف چیخنے چنگھاڑنے کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ اندر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا: ''حضور آپ دو سو روپیہ دے دیجیے۔ لڑکی سوئی ہوئی ہے۔ اس کی ماں اسے جگا رہی ہے۔ آپ انتظار کیجیے، وہ چند منٹوں میں تیار ہو جائے گی۔''

میں نے دو سو روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ پھر اندر چلا گیا۔ دفعتاً میرا دل وہاں سے بھاگ جانے کو شدت سے چاہنے لگا۔ میرے خیالات کچھ اس طرح کے محسوسات کے مجموعی تاثر پر مشتمل تھے۔

اس گھر میں رہنے والوں کی غربت کا جی ان کی تذلیل سے ابھی پوری طرح نہیں بھرا۔ اس لیے ان کی غربت نے انہیں اور زیادہ ذلیل کرنے کی سازش میں مجھے ایک آلہ کار کے طور پر ساتھ شامل کر لیا ہے۔ مجھے بلاوجہ ان لوگوں کے خلاف غربت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے۔

یہ دُلا بتائے بغیر مجھے کسی خفیہ راستے سے شیر علی کی حویلی میں لے آیا ہے اور خود حمیدہ کو بلانے گیا ہے کہ وہ آ کر مجھے بتائے کہ میں اپنے باپ کا نہیں بھائی کا بیٹا ہوں۔ حمیدہ کے آنے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

انسانوں سے ان کی انسانیت خرید کرنا تو میرا دھندہ نہیں۔ میں تو کپاس کا تاجر ہوں۔ پیشتر اس کے کہ میری تجارتی جنس کے علاوہ اور جنس کا سودا مجھ پر تھوپ دیا جائے، مجھے یہاں سے چلنا چاہیے۔

میں اپنی تکمیل کی تلاش میں ایک اجنبی ڈگر پر چلتے چلتے اب ایک موڑ پر آ پہنچا ہوں، یہ ڈگر کسی منزل پر نہیں پہنچتی، بس تھوڑی دور جا کر ذات کے بھیانک صحراؤں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتی ہے۔ یہ موڑ مڑنے سے پہلے واپس چلے جانا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں نے کار سٹارٹ بھی کی، پھر اس خیال سے رک گیا کہ ڈُلے کے سٹیج کردہ ڈرامے کے کلائمیکس یعنی لڑکی کو ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، جس کے لیے اتنی دور سے چل کے آیا ہوں۔

کیا میں واقعی اتنی دور سے اس لڑکی کی خاطر چل کر آیا ہوں؟

'نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ تو صرف ایک کھیل تھا۔ وقت کٹی کا ذریعہ۔ آوارگی کے لیے یوں ہی ایک لایعنی مقصد تلاش کرنے کی کوشش۔ مقصد چاہے کتنا ہی مبہم اور بے معنی کیوں نہ ہو، آخر ہونا تو چاہیے۔ لوگ تو قتل تک کے لیے معقول مقصد تلاش کر لیتے ہیں؛

ڈُلا جلد ہی لوٹ آیا اور کہنے لگا: ''کمال کر دیا حضور آپ نے۔ ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں۔ اندر تشریف لے جائیے نا۔'' میں کار کو تالا لگا کر ساتھ چل پڑا۔

کمرے میں ایک دھندلے سے بلب کے نیچے، کٹے ہوئے کھچڑی بالوں والی ایک موٹی کالی عورت بے زاری کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کا بے ڈول گوشت گھٹنے تک پہنچتے فراک میں سے جگہ جگہ پر لوتھڑوں کی صورت میں باہر کو ڈھلکا پڑا تھا۔ اس کی موٹی موٹی پنڈلیوں پر نسیں جا بجا اس طرح ابھری ہوئیں تھیں جیسے بہت سے کیچوے اس کی پنڈلیوں پر چڑھ گئے ہوں۔ کمرے میں ایک عجیب بو پھیلی ہوئی تھی جو غالباً پیشاب، غلیظ انسانی جسموں کے پسینے اور سیلن کی بوؤں سے مل کر وجود میں آئی تھی۔

''حضور! یہ ممی ہیں۔''

''ہیلو!''

''ہیلو!''

''حضور! اب مجھے اجازت بخشیے۔ کوٹھی کا پتہ دے دیجیے۔ شام کو وہاں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''نہیں نہیں! میں شام کو وہیں ملوں گا، جہاں آج ملا تھا۔''

''بہت بہتر!'' کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا جو دوسری کرسی کی نسبت کم خستہ حالت میں تھی۔ سامنے دیوار پر ایک بدرنگ سی تصویر ٹنگی ہوئی تھی جس میں مریم ننھے منے عیسیٰ کو گود میں لیے نہایت شفقت اور استغراق کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

ان لوگوں نے آخر یہ تصویر گھر میں خیر و برکت کے لیے لٹکائی ہوگی۔

ممی اندر جانے لگیں تو میں نے پوچھا: ''ڈرنک مل جائے گا؟''

''یُو مین وہسکی؟''

''ہاں!''

''مائی سَن پیٹر پیتا ہے۔ اس سے معلوم کرتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ وہسکی کی بوتل جس میں سے تقریباً ایک چوتھائی پی جا چکی تھی، لیے آ گئی: ''پیٹر بولتا ہے اس کا سو روپیہ لگے گا۔''

اندھا کیا مانگے، دو آنکھیں۔ میں نے سو روپیہ نکال کے دے دیا۔ اور کہا: ''پلیز گلاس اور پانی۔'' وہ یہ چیزیں لینے کے لیے گئی تو میں بوتل کو منہ لگا کر دو تین گھونٹ پی گیا۔ شراب میری زبان، حلق اور چھاتی کو تیز چھری کی طرح چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ چونکہ بہت دیر کے بعد پی رہا تھا، اس لیے جلد ہی دماغ میں دو تین زناٹے دار چابک سے لگے اور وہ ان جانا ملال، گھبراہٹ اور بیزاری جو بوجھ بن کر میرے دل پر سوار تھے فوراً تحلیل ہو کر کہیں گم ہو گئے۔ ممی نے آ کر بتایا: ''میری ریڈی ہے۔'' گلاس اور پانی ادھر اس کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔ دیکھو پلیز مارننگ ہونے والا ہے، تم ادھر سے جلدی جائے گا۔ پیٹر اس کو لائیک نہیں کرتا۔ ہمارا فیملی بڑا نوبل ہے، بدنامی کا خطرہ ہوتا، ہونہہ، پلیز، جلدی۔''

مَیری کے کمرے میں مجھے پہنچا کرمی نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ اس گھر میں پھیلی ہوئی ملی جلی بوؤں کا رنگ اس کمرے میں اور زیادہ گہرا ہوگیا تھا۔ پلنگ (جس کے چوتھے پائے کی جگہ اینٹیں رکھ دی گئی تھیں) کے پاس دروازے کی طرف پیٹھ کیے دوپٹہ اوڑھے ایک عورت کھڑی تھی۔ لٹکے ہوئے ننگے بازو چمکتے ہوئے گورے رنگ کے تھے۔ اس کی تنگ شلوار قمیص میں سے پھیلے ہوئے بھاری کولہے نمایاں تھے۔ تو یہ عورت اس وقت میری ہے۔ میں جس طرح کہوں گا اسی طرح میری خدمت کرے گی۔ جو عورت سے کسی خدمت لینے کا اہل نہیں۔ خدا معلوم کس پشت میں کون گوری نسل کا انسان اسے اپنا چمکتا ہوا گورا رنگ ورثے میں دے کر خود کسی قبر کے اندر مٹی میں مل کر مٹی ہو چکا ہوگا۔ آج اگر اسے پتہ چل جائے کہ اس کا رنگ ایک کالے کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا تو وہ قبر سے نکل کر اپنا رنگ اس سے چھین کر واپس قبر میں جا سوئے۔ اس نے بھی تو کبھی کالا رنگ ...... میرا رنگ...... خرید کیا ہوگا جس کے سبب مَیری گوری ہوگئی۔

'ہاں! وہ گورا تھا، اسے حق تھا۔'

'ہاں! میں کالا ہوں، آج مجھے یہ حق ہے۔'

لیکن مَیری بے چاری ہمیشہ غلط ہاتھ پر کیوں ہوتی ہے۔ میں نے بوتل کو منہ لگا کر ایک دو گھونٹ اور کھینچے۔ اور پھر آگے بڑھ کر مَیری کو اپنی طرف گھمایا۔ مچھلی کے منہ کی طرح چوڑا سا دہانہ اور اس پر چپکی ہوئی ایک احمقانہ سی مسکراہٹ، جس سے وہ منہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلا ہوا لال لال زخم دکھائی دیتا تھا۔ ذرا سی ناک، آنکھوں کے اوپر اور نیچے کے غلاف دور تک پیچھے کو دھنسے ہوئے تھے۔ بغیر بالوں کی پلکوں میں سے باہر ابلی پڑتی سرخی مائل زرد آنکھیں یوں لگتی تھیں جیسے پیپ ملے خون سے لبالب بھری پیالیوں میں سیاہ ریٹھے تیر رہے ہوں۔ خالی بھنوؤں پر کہیں کہیں اکا دکا بال سرکنڈے کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ پچکا ہوا چھوٹا سا ماتھا۔ اس کے اوپر ننھا سا سر لیکن گردن اس سر کا بوجھ بھی ٹھیک سے سہارنے کے قابل نہ تھی اور ہر وقت ڈولتی رہتی۔ یہ عورت ہے؟ میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔

وہ میری طرف پاؤں کھسکاتے آہستہ آہستہ ایسی چال سے چلی آ رہی تھی جیسے اس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں نہ ہوں۔ وہ کیا چاہتی ہے؟ لپٹنا؟ جیسے کہ اس کو سکھایا گیا ہوگا۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھے آ کر لپٹ جاتی، میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور کہا:

''مریم، مریم۔ نہیں، مَیری پلیز بسٹ ڈاؤن۔ پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔'' ڈولتی ہوئی گردن پر دھرے دھرے سے طوطے کی طرح رٹا ہوا فقرہ برآمد ہوا: ''مائی ڈارلنگ۔ آئی لو یُو۔''

میں نے اسے پلنگ پر بٹھایا، بوتل ہاتھ میں پکڑی اور دبے پاؤں یہ سوچتا ہوا باہر آ گیا کہ گوری نسل والا وہ انسان بھی کتنا کمینہ تھا کہ جب اس سے اپنا رنگ واپس نہ چھین سکا تو بڑا سا پتھر دھپ سے اس کے منہ پر مار کر اس کی صورت مسخ دی، کہ کوئی کالا کبھی بدلا نہ چکا سکے۔ مگر کالے اس سے بھی زیادہ کمینے ہیں کہ سوجھ بوجھ سے عاری مَیری کو بھرپور کولہوں اور چھاتیوں ہی کو مکمل عورت سمجھتے ہوئے بھگتان کر کے چل دیتے ہیں۔ جنگ دراصل ہوتی ہی [illegible] کی دوڑ ہے۔ اس دوڑ میں دونوں میں سے کون کامیاب رہا، یہ تو صرف مَیری ہی بتا سکتی تھی۔ مگر وہ تو کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔

☆☆☆

مَیری کے گھر سے نکلا تو ہر چہار طرف معمول کے مطابق پھر ایک اور نئی صبح ابھر رہی تھی۔ اکا دکا لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ چائے خانے اور حلوائیوں کی دکانیں کھل رہی تھیں۔ سڑکوں پر جھاڑو پھیرا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کا سامنا کرنے کے لیے شہر کی نوک پلک درست کی جا رہی تھی۔ گویا وہ بھی مَیری کی طرح کوئی فاتر العقل عورت تھی جسے تھوڑی دیر میں کسی نامرد شخص کے سامنے جنسی اختلاط کے لیے پیش کرنا ہو۔ میں نے شراب پینا چاہی لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ طبیعت کسی طور پینے پر آمادہ نہ ہو رہی تھی۔ لاچار بوتل کا ڈھکنا بند کر کے سے سیٹ کے نیچے لڑھکا دیا۔ نشہ نہ ہونے کے باوجود پورا جسم ڈھیتا جا رہا تھا۔ حواس پر قابو نہ تھا۔ فوری طور پر مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچا تھا مگر میں اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی کیفیت سے دوچار تھا۔ میں گھر پہنچ کر ایک سکتے کے عالم میں جا کر بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔ ذہن پرانی ہڈی کی طرح خشک اور خالی تھا۔ دینو نے چائے لا کر میری میز پر رکھی اور بتایا کہ آٹھ بج گئے ہیں۔ میں ٹس سے مس ہوئے بغیر چھت کو گھورتا رہا۔ ساڑھے آٹھ بجے اس نے آ کر بتایا کہ ناشتہ میز پر لگا دیا ہے مگر میں لاش کی طرح بستر پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے چھت کو گھورتا رہا تھا۔ نو بجے آ کر اس نے دیکھا تو میں اسی طرح پڑا تھا۔ اس نے پوچھا: ”آج کیا دفتر نہیں جائیں گے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

میں ہزار کوشش کے باوجود بولنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔ لیکن مشینی انسان کی طرح بستر سے اٹھا اور تیاری میں مصروف ہو گیا اور تیار ہو کر بغیر کچھ کھائے پیئے یا کسی سے بات کیے کار میں دفتر روانہ ہو گیا۔ میں ہر شعور سے عاری ہو چکا تھا، کیوں؟

جیسا کہ بعد میں ڈاکٹروں سے معلوم ہوا، اس لیے کہ میں کئی سالوں سے اپنے ذہن کے کناروں کو پکڑ کر انتہائی بے دردی سے جھنجھوڑتا اور کھینچتا رہا تھا جس کے نتیجے میں میرے ذہن کے اندر دیوار بننا شروع ہو گئی تھی...... زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بچنے کے لیے ناواقفیت کی حفاظتی دیوار...... ڈاکٹروں کے مطابق مَیری والا واقعہ محض تنکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جیسے پیاس سے مرتا صحرا کا مسافر آخری سراب کے دھوکے کا متحمل نہ ہوتے ہوئے گر کر دم دے دے۔ میں اپنے ذہن کے اندر شاید دیوار بہت بلند نہ بنا سکا تھا اس لیے دو تین ماہ کے عرصے ہی میں لوگوں نے کھینچ کر مجھے باہر نکال لیا۔ میں جتنا عرصہ دیوار کی اوٹ میں سر چھپا کر بیٹھا رہا، مجھے اب کچھ یاد نہیں کہ اس دوران مجھ پر کیا گزرتی رہی۔ بالکل اسی طرح جس طرح پاگل پن سے پہلے کے حالات و واقعات سے میں ناواقفیت کی دیوار کی اوٹ میں چھپ کر قطعی، اجنبی لاتعلق اور بے بہرہ ہو گیا تھا۔ دراصل جو دیوار کے اندر تھا وہ میں نہیں تھا، اور اب جو دیوار کے باہر ہے وہ وہی شخص نہیں جو پاگل تھا، اس لیے ایک دوسرے کی بات کیسے یاد رہ سکتی ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ جون بدلنے والا قصہ ہے، نیا جنم لینے پر پچھلے جنم کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ جس طرح دیوار سے باہر رہنے کا ایک مجموعی ضابطہ، طریقہ اور انداز ہے اسی طرح پسِ دیوار رہنے کا ایک انفرادی ضابطہ، طریقہ اور انداز ہوتا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ انفرادی ضابطہ مجموعی ضابطے کی نسبت زیادہ آزاد اور کھلا کھلا ہوگا۔ کیونکہ انفرادی ضابطے کے تحت اپنی حدود کو تصادم کے خطرے کے بغیر پوری کائنات بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلایا جا سکتا ہوگا۔ (میں کہیں غیر شعوری طور پر پھر دیوار کھڑی کرنے کی خواہش تو نہیں کر رہا؟ مجھے آج ڈاکٹر سے پھر ملنا چاہیے۔)

یہاں تک تو مجھے بھی یاد ہے کہ اس روز معمول کے مطابق کار دفتر کے سامنے مخصوص

جگہ پر لا کھڑی کی، اس کے بعد کی کہانی جس طرح مسٹر عزیز میرے دفتر کے جنرل مینجر نے
مجھے بیان کی، آپ بھی سن لیجیے:

''آپ خوفزدہ حالت میں دوڑ کر عمارت میں داخل ہوئے۔ لفٹ بوائے نے سلام
کیا اور حسب معمول آپ کو سوار کرانے کے لیے لفٹ کا دروازہ کھول دیا۔ آپ اس کا کوئی
نوٹس لیے بغیر بھاگم بھاگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چوتھی منزل پر دفتر پہنچے۔ جب آپ
ہال سے گزرے تو بال بکھرے ہوئے تھے۔ دم پھولا ہوا تھا اور مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتے جاتے
تھے اور قدم تیز سے تیز تر کرتے جاتے تھے۔ جیسے کوئی بلا آپ کا پیچھا کر رہی ہو اور خطرہ ہو
کہ کسی لمحے بھی آن دبوچے گی۔ آخر میں آپ دوڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے، پورا
دفتر حیران رہ گیا کہ آخر ایم ڈی صاحب پر ایسی کونسی آفت آگئی کہ اس قدر حواس باختہ
حالت میں اپنے کمرے کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ ہال میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔
رمضان چپڑاسی میرے کمرے میں بھاگا آیا کہ فوراً چل کر دیکھیے، ایم۔ڈی صاحب کو کچھ
گڑبڑ ہے۔

میں نے گھبرا کے پوچھا: ''کیوں خیر تو ہے؟''
کہنے لگا: ''جناب! پتہ نہیں، آپ خود ہی دیکھ لیں۔''
میں آپ کے کمرے میں آیا اور آپ اوندھے منہ میز کے شیشے پر زور زور سے اپنا چہرہ
رگڑ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: ''سر! خیریت تو ہے؟'' آپ نے پہلی بار اس دن مجھے
میرے نام کی بجائے میرے عہدے سے مخاطب کیا اور کہا کہ میں فوراً نیچے جا کر دیکھوں کہ
ایک بوڑھی سی دیہاتی عورت جس نے لمبا کرتا اور تہمد پہنا ہوا ہے، سر پر گاڑھے کی چادر ہے
اور پاؤں میں دیسی جوتا ہے اور بغل میں گٹھڑی دبائی ہوئی ہے، بازار میں آپ کا پتہ تو نہیں
پوچھتی پھر رہی؟ اور کہا کہ لفٹ بوائے اور چپڑاسیوں کو ہدایت کر دوں کہ اگر اس حلیے کی کوئی
عورت دفتر میں آ کر پوچھے تو وہ صاف کہہ دیں کہ اس نام کا کوئی شخص یہاں نہیں ہوتا۔ میں
نے کہا: ''سر! آپ کی طبیعت اچھی نہیں۔ چلیے میں گھر پہنچا دوں اور آج آپ آرام کیجیے۔''

آپ نے خلاف معمول ڈپٹ کر کہا: ''جو کام تمہیں کہا ہے وہ فوراً کرو۔'' آپ کی پھٹی پھٹی سی
خوفناک آنکھیں اور اعصاب کے کھنچاؤ سے قدرے بھیانک ہوتے ہوئے چہرے کے
نقوش دیکھ کر میں آپ کے بارے میں حد درجہ فکر مند ہو گیا۔ میں نے کمرے سے نکل کر باہر
تالہ لگا دیا اور دو تین چپڑاسیوں کو مامور کیا کہ آپ کے بتائے ہوئے حلیے کی عورت کا نیچے
جا کر ادھر ادھر سے پتہ چلائیں اور خود ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ٹیلیفون کرنے لگا۔
فارغ ہو کر آیا تو دیکھا کہ آپ اسی طرح شیشے پر چہرہ رگڑ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی
آپ نے پوچھا: ''وہ عورت میرا پتہ تو نہیں پوچھ رہی تھی؟'' میں نے تسلی دینے کے لیے کہا
کہ 'بازار میں ہر طرف تلاش کر چکا ہوں، اس حلیے کی کوئی عورت نہیں ملی۔' آپ یہ جواب سن
کر پھر اسی طرح شیشے سے منہ رگڑنے لگے اور نہایت مایوسی کے عالم میں کہا: ''نہیں! وہ
عورت یہیں ہے، یہیں ہے اور ابھی یہاں پہنچ جائے گی۔''
میں نے کہا: ''آپ شیشے پر اور زیادہ چہرا نہ رگڑیں، پہلے ہی سرخ ہو رہا ہے۔''
آپ نے جواب دیا: ''تم دیکھ نہیں رہے کہ میرے چہرے پر اتنی بہت سی کالک تھپی
ہوئی ہے۔ اسے اتار رہا ہوں۔''
میں نے کہا کہ 'آپ چہرہ بالکل صاف ہے۔ آئینہ دیکھ لیجیے۔' آپ نے جواب دیا:
''میں نے آئینہ دیکھا ہے، بہت اچھی طرح دیکھا ہے، اتنی بار دیکھا ہے کہ اور زیادہ دیکھنے کا
حوصلہ نہیں۔ میرے چہرے پر کالک کی ایک دو تہیں تھوڑا ہی ہیں۔ سینکڑوں ہیں، ہزاروں
ہیں۔ کالک مجھ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ میری آنکھوں کی سفیدی سیاہ ہو چکی ہے۔
یہ دیکھو میرے دانت بالکل سیاہ ہیں۔ میرے حلق میں جھانکو، اندر سب سیاہ ہے۔ میں کالک
کھاتا ہوں، کالک اگلتا ہوں اور کالک کا ہی سانس لیتا ہوں۔ میری ہڈیاں تک سیاہ ہو گئی
ہیں۔ جب میں مروں گا تو دیکھ لینا، میرا پورا جسم اس طرح سیاہ ہو گا جیسے کان سے نکلے
ہوئے تازہ کوئلے سے بنا ہو۔''
میں نے پوچھا: ''مگر اس طرح چہرہ رگڑنے سے کیا ہو گا؟''

آپ نے کہا: ''کچھ تو کالک کم ہوگی۔''

میں نے منت کرتے ہوئے کہا، ''نہیں سر! آپ گھر چلیے، آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

آپ نے کہا: ''جنرل منیجر یوں کیوں نہ کروں، وہ راز جس کے افشاء ہونے سے اتنا ڈرتا ہوں، اسے خود ہی تمام دنیا پر کھول دوں؟'' میں نے کہا: ''خدا کے لیے سر، نہیں، آج نہیں۔ آپ کی طبیعت بے حد خراب ہے، کل بتا دیجیے گا۔''

آپ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو میں نے آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر آپ نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے مجھے دیوار کے ساتھ دے مارا اور ہال سے نکل گئے۔ آپ نے بلند آواز میں کہا: ''سنو۔''

پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ٹک ٹک کرتی ٹائپ مشینیں خاموش ہو گئیں اور میزوں پر جھکے ہوئے سر اوپر اٹھ کر آپ کو توجہ سے دیکھنے لگے۔ آپ نے کہنا شروع کیا: ''اس شہر میں کہیں سے ایک دیہاتی عورت آ گھسی ہے۔ وہ ایسے ہی غلط ملط باتیں کہتی ہے۔ وہ میری ماں نہیں ہے، جیسے حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا ویسے ہی میری کوئی ماں نہ تھی۔'' ہال میں لوگ ہنسنے لگے۔ میں بار بار آپ کو کمرے میں جانے کے لیے کہتا رہا مگر آپ سنتے ہی نہ تھے اور تقریر کرتے جاتے تھے: ''میرے باپ نے اپنی صلب نالی میں پھینک دی۔ نو مہینے گزرنے کے بعد لوگوں نے مجھے نالی سے اٹھا لیا۔ میری صورت دیکھی۔ قصبے کے جس شخص سے ملتی تھی، اس کے پاس پہنچا دیا اور وہ میرا باپ تھا۔'' ہال میں باتوں اور ہنسی کا ملا جلا شور برپا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر آن پہنچا۔ تین چار آدمیوں نے مل کر آپ کو پکڑا اور ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا۔ تھوڑی دیر بعد آپ غنودگی طاری ہو گئی اور ہم آپ کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مینٹل ہسپتال لے گئے، وہاں انہوں نے آپ کو داخل کر لیا۔''

میں آج کی نشست میں محض چند فقرے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا کہ میں پاگل ہو گیا تھا، پھر ٹھیک ہو گیا......اور اب خطرہ لگا رہتا ہے کہ پھر پاگل نہ ہو جاؤں۔ لیکن بات آہستہ آہستہ

یہاں تک پھیل گئی کہ اس میں پاگل ہونے کی پوری داستان سمٹ آئی۔ خیر، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جب تم محسوس کرو کہ پھر سے ذہن کے کونوں کو پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کرنے والے ہو تو لکھنے بیٹھ جایا کرو۔ اس طرح وہ جذبات، خیالات اور احساسات جو تمہاری کھوپڑی کے ڈھکنے کے نیچے گل سڑ کر ٹیو دینے لگتے ہیں اور ان کی بساند سے تمہارے دماغ کو تبخیر کا عارضہ ہو جاتا ہے، اس سے محفوظ رہو گے۔

سڑاپ.......... مکھی پھر نکل گئی۔ وہ سامنے اڑی جا رہی تھی۔ میں قلم میز پر رکھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دروازے کے پٹ اور دیوار کے درمیان کونے میں بیٹھ گئی۔ یہاں تو مکھی مار بیکار ہے۔ اس کا چوڑا پتہ دونوں ابھاروں کے درمیان رک جائے گا اور مکھی پھر بہ حفاظت تمام اڑی جا رہی ہوگی۔ اس ایک مکھی نے ناک میں دم کر دیا۔ پھر کوشش کرتا ہوں شاید مکھی مار کا کوئی کونا اس کے پر وغیرہ سے ٹکرا جائے اور یہ زخمی ہو کر گر جائے تو اسے پاؤں سے مسل دوں۔ سڑاپ...... وہ چھت کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ لو! اب وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ میں اگر چھپکلی ہوتا تو دھپ دھپ دوڑتا اک کے پیچھے وہاں پہنچ جاتا اور گھپ سے کھا جاتا۔ اگر مکڑی ہوتا تو جھٹ سے وہاں پہنچ کر جالا تان کر اس کو پھانس لیتا اور پھر اطمینان سے بیٹھا نگلتا رہتا۔ مگر افسوس کہ میں ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہوں۔ تھک کر کرسی پر بیٹھ کر لکھنے لگا۔ لیکن مکھی مار بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جونہی قریب آئے گی ایک سڑاپ سے دوں گا اور یہ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹ جائے گی۔ آج کمرے میں کہیں بہت سی مکھیاں گھس آئی تھیں۔ ممکن ہے دینو سے دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔ میں نے کھڑکیاں دروازے بند کر کے کمرے میں مکمل اندھیرا کر لیا اور ایک دروازے کو ذرا سا کھلا رکھا کہ روشنی کی ایک لکیر دروازے کے پٹوں کے درمیان سے نکل کر چوکھٹ کے ساتھ ہی فرش پر ایک چھوٹا سا دھبا بنا رہی تھی۔ دھبا روپے کے سکے جتنا بڑا ابرص کے داغ کی طرح سفید تھا۔ کالی مکھیاں اپنے ہاتھ ملتی ہوئیں اس سفید دھبے پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ اور وہاں سے روشنی کی لکیر میں سے گزر کر دروازے کے پار جا رہی تھیں۔ سب گزر گئیں صرف ایک مکھی رہ گئی، بالکل اسی طرح جیسے

میں نے دیوار اونچی کر کے اپنے اندر اندھیرا کر لیا تھا۔ ذہن میں بیٹھی ہوئی بھنبھناتی ہوئی کالی مکھیاں، روپے جتنے بڑے دھبے پر بیٹھ کر ہاتھ ملتی ہوئی پار ہو گئیں تھیں۔ بس ایک مکھی رہ گئی تھی۔ میں ان دنوں جو غل غپاڑہ مچاتا یا دنگا فساد کرتا نظر آتا تھا وہ یوں ہو گا کہ میں اس ایک مکھی کو مارنے کے لیے لپک جھپک مکھی مار لیے پھرتا ہوں گا اور دیکھنے والوں کو غل غپاڑہ مچاتا اور دنگا فساد کرتا نظر آتا ہوں گا۔ کاغذ پر ایک آدھ سطر لکھی تھی کہ وہ کان پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے مکھی مار کو دائیں ہاتھ میں منتقل کر کے مضبوطی سے پکڑ لیا اور پھر اسے کان سے اڑایا۔ وہ میرے سامنے تیزی سے ایک دو نیم دائرے سے بناتی ہوئی ایک طرف کو نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ماتھے پر آ کر بیٹھ گئی، اڑایا، گردن پر بیٹھ گئی، اڑایا، پلکوں پر بیٹھ گئی۔

میں جھنجھلا کے کھڑا ہو گیا۔ وہ مکھی مار کے ہینڈل پر بیٹھی ہاتھ ملتی یا تالیاں بجاتی ہوئی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ اب کیا کِیا جائے۔ میرے پاس تو صرف یہی ایک ہتھیار تھا اور اس پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ اب اس کو مکھی مار سے تو نہیں مارا جا سکتا۔ میں مکھی پر نظر رکھے کسی مناسب چیز کی تلاش میں کمرے میں مارا مارا پھرنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ مکھی اب مکھی مار اٹھا کر سڑاپ سڑاپ میرے جڑنا شروع کر دے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ کرنا کیا ہے کمرے سے کود کر باہر چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی یوں ہی ہوا تھا۔ یہ کیا کہ میں ہر بات کے ڈانڈے اپنی اس زندگی سے ملانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں جو بہت مختصر تھی اور زیادہ سے زیادہ تین ماہ ہو گی۔ ایک پرانے رسالے کو دہرا کر کے زپ سے ہینڈل پر مارا۔ دشمن کھیت رہا۔ یہ مکھی تو میں نے مار لی لیکن وہ مکھی جس کی بھنبھناہٹ اب بھی کبھی کبھی ذہن کے اندر سنائی دیتی ہے، اس کا کیا کیا جائے۔ اسے کسی طرح کھینچ کھانچ کر باہر نکال کر قلم کی مدد سے کاغذ پر مارنا چاہیے۔ ڈاکٹر نے بھی کچھ ایسی ہی ہدایت کی تھی۔ اچھا کوشش کرتا ہوں۔

انسان کی زندگی، ماضی، حال اور مستقبل سے پوری طرح مربوط ہوتی ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے، سب ایک اکائی ہے۔ مربوط، مضبوط، اٹوٹ اکائی۔ جس طرح میرے جدِ امجد کے بیج سے پیدا تو ایک بچہ ہوا ہو گا لیکن اس میں اس وقت

میں بھی تھا جس کو ہزاروں سال بعد پیدا ہونا تھا اور جو پشت در پشت سفر کرتے کرتے اب وجود میں آیا۔ حالانکہ میں دراصل وجود میں پہلے بھی تھا۔ اس حالت کو عدم وجود تو نہیں کہا جا سکتا۔ میری اپنی تو کوئی اولاد نہیں لیکن بھائیوں کے پوتوں، پڑپوتوں، لکڑ پوتوں اور آگے تک میں، میں کسی نا کسی طرح زندہ رہوں گا، جیسے آج وہ مجھ میں زندہ ہیں۔ ہاں! اس بات میں ان زمینوں کا ذکر نہیں آیا جو بیج کو قبول کر، اسے بنا سنوار کر، اس میں اپنا رنگ اور بو شامل کر کے تیار شدہ مال (Finished Product) کی حیثیت میں پیش کرتی ہوں۔ رضیہ کی اولاد میں، میں بھی تو کسی نہ کسی طور موجود رہوں گا اور رضیہ کی اولاد بھی کسی نہ کسی طور اس وقت مجھ میں موجود ہے۔

اس مسئلے کو جب اس کی تمام لمبائی، چوڑائی اور گہرائی سمیت ذہن میں لانے کی کوشش کرتا ہوں تو ذہن اس طرح جھپ کھا جاتا ہے جیسے یہ سوچتے ہوئے جھپ کھا جایا کرتا ہے کہ اس نظامِ شمسی میں ہماری زمین ایک مختصر سیارہ ہے اور اس کہکشاں میں اس طرح کے کروڑوں نظامِ شمسی موجود ہیں اور پوری کائنات میں اس طرح کی لاکھوں کہکشائیں ہیں۔ میں نے اپنے سے بہت بڑے مسئلے پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور ہو گا یہ کہ مکھی اسی طرح ذہن میں بھنبھناتی رہ جائے گی اور موقعہ ملنے پر پھر آفت مچا دے گی۔ بات وہیں سے پھر شروع کرتا ہوں۔ اپنے ماضی سے مربوط ہونے کی وجہ سے جو کچھ میں ہوں، اپنی ذات سے بندھا ہوا ہوں۔ اب میں اس سے بھاگ کر، اپنے آپ سے بغاوت کر کے کہیں نہیں جا سکتا۔ مجبور ہوں، میرے جیسے حالات میں کوئی پاگل نہ ہوتا تو خودکشی کر لیتا۔ خودکشی نہ کرتا تو تارک الدنیا ہو جاتا۔ تارک الدنیا نہ ہوتا تو مجرم بن جاتا، مجرم نہ بنتا تو کسی طور پر جابر و قاہر سلطان بن جاتا۔ جابر و قاہر سلطان نہ بنتا تو مصلح بن جاتا اور پورے معاشرے کو سوچ کی ایک نئی نہج دے دیتا جس سے اس طرح کے حالات و واقعات اس کے لیے ایسی تکلیف دہ اور باعثِ شرم صورتِ حال پیدا کرنے کا سبب نہ رہتے۔ لیکن ہر کسی کا حلقۂ کار بھی تو ازل سے اس کی اپنی ذات کے اندر بند ہے۔ مقدر ہے...... اور کوئی اس کی حدود سے باہر نکلنے کا

اہل نہیں۔ اور یوں پاگل ہونے والا خودکشی نہ کرتا، خودکشی کرنے والا تارک الدنیا نہ بنتا، تارک الدنیا ہونے والا مجرم نہ بنتا، مجرم بننے والا جابر و قاہر سلطان نہ بنتا اور بیشتر لوگ کچھ بھی نہ بنتے، محض بیل کی طرح کھاتے رہتے، زندگی کے جوئے میں جتے رہتے اور موت آتی تو مر جاتے۔ سماجی ماحول کو (یہ کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا) تو کسی ایک معاشرے کی مجموعی سوچ اور اندازِ فکر متعین کرتی ہے اور جب یہ سوچ اور فکر پرانی ہو جاتی ہے، گھس جاتی ہے اور لوگ غیر شعوری طور پر اس کی پابندیوں سے تھک چکے ہوتے ہیں تو کوئی آ کر معاشرے کو نیا رخ دے دیتا ہے اور مصلح کہلاتا ہے۔ میں اگر آج سے دس ہزار سال پہلے پیدا ہوا ہوتا تو کوئی مجھے میرے بھائی کا بیٹا کہہ کر ذلیل نہ کرتا۔ کوئی میری ماں کو دنیا کا ذلیل ترین گناہ کرنے کا مرتکب نہ ٹھہراتا، چاہت کا وہ ابلتا ہوا دھارا جو تمام عمر انسانوں کو زندہ رہنے کا جذبہ عطا کرتا رہتا ہے، میں اسے دھتکار چکا ہوں۔ کیوں؟

اپنے آپ کو مجرموں کی طرح چھپاتا پھرتا ہوں۔ کیوں؟

میرے لیے عورت ایک گالی بن کر رہ گئی ہے۔ کیوں؟

میں تمام عمر کسی عورت سے جنسی اختلاط نہیں کر سکا۔ کیوں؟

اس لیے کہ میں کوئی زندگی پیدا کرنے کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں جو میری طرح تمام عمر اپنے والدین کی غلطی کی کالک اپنے منہ سے نوچ نوچ کر پھینکنے کی کوشش کرتی رہے اور وہ اسی طرح اس کے چہرے پر تھپی رہے۔ میں دراصل عبوری دور میں پھنس گیا ہوں۔ پرانی اقدار فرسودہ ہو چکی ہیں۔ نئی اگرچہ پیدا ہو رہی ہیں لیکن ابھی وجود میں نہیں آئیں۔ دنیا اس وقت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور شاید چند صدیوں میں نئی اقدار تولد ہو جائیں، اب چونکہ مصلحوں کے آنے کا دستور تو ختم ہو گیا (جو نئی اقدار کو منجھی ہوئی دائیوں کی طرح معاشرے کی کوکھ سے کھینچ کر باہر لے آیا کرتے تھے) اس لیے انسانیت کو خود ہی مجموعی طور پر کوشش کر کے نئی اقدار کو اپنے اندر سے پیدا کر کے باہر لانا ہے۔ ہمارا خدا کہاں ہے؟ وہ تو گم ہے۔ کہیں چلا گیا ہے۔ جیسے کوئی گڈریا اپنی بھیڑوں کے گلے کو جب وہ نہایت انہماک سے

چرنے میں مصروف ہوں، چھوڑ کر چپکے سے کہیں کھسک جائے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے خدا وہ سوکھا سڑا بوڑھا پٹھان ہے جو اپنا پھٹا ہوا غلیظ لمبا کوٹ پہنے بچوں کے سکول کے سامنے زنگ آلود کنستر پر بیٹھا گھٹنوں پر ہوائی بندوق رکھے اپنی وحشت زدہ بھوکی نظروں سے بچوں کا منتظر ہوتا ہے کہ وہ آئیں اور سامنے لکڑی کے تختے پر لگے ہوئے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے، تن کے کھڑے ہوئے انسانوں کو نشانہ بنائیں۔

اس کی بھیڑیں بھی تو سنگلاخ پہاڑوں پر اس کے انتظار میں گھوم رہی ہوں گی اور یہ یہاں زنگ آلود کنستر پر اداس بیٹھا ہے۔ جاؤ ان کے پاس جو تمہارے انتظار میں ہیں۔ کیوں لوہے کی سلاخ میں پروئے انسانوں پر بچوں سے چھرے چلواتے ہو جو کہیں ہل کے جا بھی نہیں سکتے۔ اور وہیں سلاخ پر اپنے پروئے ہوئے بدنوں کے اردگرد دیوانہ وار چکر کھا کے پھر نیا چھرا کھانے کے لیے رک جانے پر مجبور ہیں، جاؤ۔

میرے بھائی! نہیں معاف کیجیے، میرے باپ نے اگر میری سوتیلی ماں سے مل کر مجھے پیدا کیا تو پرانے، نہایت پرانے دستور کے مطابق نہ تو اچھا کیا اور نہ برا کیا۔ لیکن آج کے زمانے میں مجھے بدترین قسم کے حرامی ہونے کی لعنت سے کیونکر چھٹکارا ملے۔ نئی اقدار ابھی پیدا نہیں ہوئیں، خدا کہیں گم ہے۔ میں ابتدائے آفرینش سے اپنی ذات کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ ان حالات میں ناواقفیت کی دیوار کے پیچھے چلے جانا چاہیے۔ اس طرح اگرچہ ہر چھرے سے سلاخ پر دیوانہ وار گھوموں گا تو سہی لیکن تکلیف کا احساس تو نہ ہوگا۔

ہاں! یہی ٹھیک ہے۔ ن غ ف ر ل

☆☆☆